

نامور مسلمان خطیب اور عالم ۱

# آسیبی باؤلی کا راز

اس حید

PDFBOOKSFREE.PK

حکیم زکریا دانی

مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی - ۲۵



نام ورُسلمان طیب اور عالم ————— ①

حکیم زکریا رازی

آسیبی باولی کاراز

اے۔ حمید

مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵

© مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

مجلسِ ادارت  
حکیم محمد سعید  
مسعود احمد برکاتی  
رفیع الزماں زبیری



تقسیم کار  
صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025

Email: [monthlykitabnuma@gmail.com](mailto:monthlykitabnuma@gmail.com)

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔ 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔ 202002

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔ 400003

قیمت :- 20 روپے

تعداد: 1000

مئی 2012ء

کلاسک آرٹ پرنٹرز، چاندنی محل، دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں طبع ہوئی۔

## پیش لفظ

یہ دور سائنس کا دور ہے۔ سائنس کی ترقی نے انسان کی زندگی کا انداز بدل دیا ہے۔ اس کو بڑی سہولتیں پہنچائی ہیں۔ سائنس کی ترقی کی بدولت انسان چاند پر بھی پہنچ چکا ہے اور اب دوسرے سیاروں کو فتح کرنے والا ہے۔

سائنس کی یہ ترقی انسان کی صدیوں کی کوششوں اور اللہ کی دی ہوئی ذہنی صلاحیتوں کے استعمال کا نتیجہ ہے۔ اللہ نے انسان کو دماغ اس لیے دیا ہے کہ وہ اس کو استعمال کر کے زمین اور آسمان کی قوتوں کو فتح کرے اور ان کو اپنے کام میں لائے اس لیے مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں سائنس کو عروج پر پہنچایا۔ آج سائنس نے جتنی ترقی کی ہے اس کی بنیاد دراصل مسلمانوں... ہی ڈالی تھی۔ یقیناً آج ہم سائنس میں پیچھے ہیں لیکن ہم آگے بڑھ سکتے ہیں اور ہمیں بڑھنا چاہیے اور جس طرح ہمارے بزرگوں نے عظیم سائنسی کارنامے انجام دیے تھے اسی طرح ہمیں بھی سائنس میں مہارت پیدا کر کے دنیا میں اعلا مقام حاصل کرنا چاہیے۔

حکیم محمد سعید



# آسیبی باؤلی کاراز

شنزاد نے ٹارچ کی روشنی کلاک پر ڈالی۔

رات کے بارہ بج رہے تھے۔ باہر کبھی کبھی بادلوں کی گرج سنائی دے جاتی تھی۔ شنزاد اپنے کمرے میں بستر پر لٹاف میں دبکا جاگ رہا تھا۔ بند کھڑکی میں سے بارش کی آواز بھی آرہی تھی۔ بارش کی وجہ سے رات بڑی سرد ہو گئی تھی۔ سردی، بارش اور آدھی رات..... ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ شنزاد بستر میں سے نکل کر دبے پاؤں چلتا دروازے کے پاس آگیا۔ اس نے بند دروازے کے ساتھ کان لگا دیا۔ وہ یہ تسلی کرنا چاہتا تھا کہ گھر کے سب لوگ یعنی اس کی امی، ابو، بہن اور بڑا بھائی سو گئے ہیں۔ گھر کے سب لوگ گرم گرم بستروں میں لٹاف اوڑھ کے گہری نیند سو رہے تھے۔ جب شنزاد کو اطمینان ہو گیا کہ کوئی اس کے پیچھے نہیں آئے گا تو اس نے المدی میں سے بند گلے کا سوئٹر نکال کر پہنا۔ پاؤں میں نل، بوٹ پہنے۔ کالے رنگ کی برساتی پہنی۔ ہاتھ میں ٹارچ لی اور اپنے کمرے کا پچھلا دروازہ آہستہ سے کھول کر کوٹھی کے چھوٹے سے باغیچے میں آگیا۔ اس نے برساتی کا حڈ اپنے سر کے اوپر کر لیا تھا۔ بارش میں بھیگی ہوئی برف کی طرح ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اس کی پیشانی سے ٹکرایا اور اس کے جسم میں سردی کی ایک لہری دوڑ گئی۔

ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ ایک چھوٹا سا بلب بجھلے برآمدے کے ایک

کونے میں جل رہا تھا۔ شہزاد کوٹھی کی عقی دیوار کے چھوٹے دروازے میں سے نکل کر کچی سڑک پر آگیا۔ اس نے ٹارچ اور دونوں ہاتھ لمبی برساتی کی جیبوں میں ڈال رکھے تھے۔ بارش کے قطرے اس کی برساتی پر گر کر نیچے پھسل رہے تھے۔ یہ کوٹھیوں کا پچھلا حصہ تھا جہاں کہیں کہیں بلب روشن تھے۔ ان کی روشنی میں شہزاد کچی سڑک عبور کر گیا اور کچی سڑک پر آ کر ایک درخت کے نیچے رک گیا۔ درخت پر سے بارش کے موٹے قطرے ٹپک رہے تھے۔

شہزاد کو علم تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ آج اس نے پراسرار باؤلی کی آئینی آواز کا راز معلوم کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ اس معصے کو حل کرنے کے لیے وہ بارش والی سرد اور سنسان رات کو اپنے گرم کمرے سے نکلا تھا۔ جس پراسرار باؤلی کا راز معلوم کرنے شہزاد گھر سے چلا تھا وہ ان کی کوٹھی سے تھوڑی دور ایک بارہ دری کے کھنڈر کے پیچھے زمین کے اندر واقع تھی۔ یہ باؤلی کہتے ہیں کہ مسلمان بادشاہ شیر شاہ سوری کے زمانے میں بتلی گئی تھی۔ تب مسافریاں سے گزرتے ہوئے تھوڑی دیر ٹھیر کر آرام کرتے۔ نہاتے منہ ہاتھ دھوتے اور پھر سفر پر چل پڑتے۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ یہ باؤلی ویران ہو گئی۔ کوئی یہاں نہیں جاتا تھا۔ دو چار مہینوں سے اس باؤلی کی ایک دہشت سی پھیل گئی تھی۔ کوئی آدمی دن کے وقت بھی اس کے قریب سے نہیں گزرتا تھا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ اس باؤلی سے کسی بچے کی آواز آتی ہے جو گھٹی ہوئی آواز میں اپنی طرف بلاتا ہے۔ شہزاد نے اس آواز کا سراغ لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ ایک سیدھا سادا مسلمان لڑکا تھا۔ شہر کے اسکول میں دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ نماز روزے کا پابند تھا۔ اللہ اور اس کے رسولؐ پر اس کا ایمان بڑا بختہ تھا۔ وہ اس قسم کی آئینی اور وہم کی باتوں پر اعتبار نہیں کرتا تھا۔ اس کا ایمان تھا کہ اللہ سے ڈرنے والا دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ کوئی آسیب نہیں ڈرا سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس بارش والی سرد اندھیری رات میں ٹارچ جیب میں

ڈالے آئیں باؤلی کی طرف چلا جاتا تھا۔ وہ اس سے کو حل کرنا چاہتا تھا کہ باؤلی سے بچے کی گھٹی ہوئی آواز کہاں سے آتی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ باؤلی میں واقعی کوئی لڑکا یا بچہ پھنس گیا ہو۔

بوند باندی اسی طرح ہو رہی تھی۔

شہزاد گیلی سڑک پر بڑے سکون سے قدم اٹھاتا بدہ دری کے پاس آگیا۔ سامنے وہ چہو ترہ تھا جس میں سے ایک اندھیرا زینہ نیچے پر اسرار باؤلی تک جاتا تھا۔ آسمان کے تارے بادلوں میں چھپے ہوئے تھے۔ شہزاد نے ٹارچ جیب سے نکل کر ہاتھ میں پکڑ لی اور اللہ کا نام لے کر باؤلی کی طرف بڑھا۔ زینے پر پہنچ کر اس نے ایک نظر نیچے ڈالی۔ زینے کی ہر سیرھی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ابھی تک اسے باؤلی کے اندر سے کوئی آواز نہیں آئی تھی۔ اس نے زینے پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ زینہ تنگ تھا۔ پندرہ بیس میٹر حیوں کے نیچے باؤلی کا پانی شیشے کی طرح چمکنے لگا۔ شہزاد نے کلمہ شریف پڑھا اور زینہ اترنے لگا۔ وہ ابھی تیسری میٹر ہی پر ہی پہنچا تھا کہ اسے ایک عجیب گھٹی گھٹی سی آواز سنائی دی۔ یہ آواز کسی لڑکے کی لگتی تھی جو مدد کے لیے پکار رہا تھا۔

”مجھے یہاں سے نکالو۔ مجھے یہاں سے نکالو۔“

یہ پر اسرار آواز سن کر ایک بد تو شہزاد کا دل بھی اندر سے دھڑک اٹھا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور بڑا حوصلہ کر کے پکار کر بولا۔

”تم کون ہو؟ اگر تم کوئی جن بھوت ہو تو یہاں سے بھاگ جاؤ۔ خلق خدا کو تنگ نہ کرو۔“

وہی پر اسرار آواز پھر آئی۔

”میں کیسے بھاگ سکتا ہوں؟ میں تو لوہے کے صندوق میں بند ہوں۔ مجھے

یہاں سے نکالو۔“



اس دوران شہزاد نے اندازہ کر لیا تھا کہ پراسرار آواز اس کی بائیں جانب ذرا نیچے سے آرہی ہے۔ وہ دو میٹرھیل اور نیچے اتر گیا۔ اس نے مارچ کی روشنی پھینکی تو اسے دیوار میں ایک شگاف دکھائی دیا۔ اس نے مارچ کی روشنی میں جھک کر دیکھا۔ یہ یک تنگ و تدریک کوٹھری سی تھی جس میں ایک طرف پرانی اینٹوں اور لمبے کا ڈھیر لگا تھا اور دوسری طرف کونے میں لوہے کا ایک صندوق پڑا تھا۔ لڑکے کی گھٹی ہوئی آواز پھر سنائی دی۔

”مجھے باہر نکالو۔ مجھے باہر نکالو۔ میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔“

شہزاد مارچ ہاتھ میں لیے شگاف میں سے گزر کر لوہے کے صندوق کے پاس آگیا۔ لوہے کے صندوق کو زنگ لگا ہوا تھا۔ اس پر لوہے کا موٹا تالا پڑا تھا اور اس کے ڈھکنے پر ایک بلی کا سر بنا ہوا تھا۔ پراسرار آواز اسی لوہے کے صندوق میں سے آرہی تھی۔ شہزاد نے پوچھا۔

”تم کون ہو؟ تمہیں صندوق میں کس نے بند کیا ہے؟“  
صندوق میں سے آواز آئی۔

”مجھے یہاں سے باہر نکالو۔ میں باہر آکر تمہیں سب کچھ بتاؤں گا۔“  
شہزاد نے کہا، ”مگر صندوق پر تو لوہے کا موٹا تالا پڑا ہے۔ میں اسے کیسے توڑوں؟“

صندوق میں سے آواز آئی۔

”تالا توڑنے کی تمہیں ضرورت نہیں ہے۔ اس صندوق کے ڈھکنے پر بلی کا جو

سر بنا ہوا ہے تم اس کو توڑ دو۔ میں اپنے آپ آزاد ہو جاؤں گا۔“

شہزاد نے مارچ کی روشنی میں بلی کے سر کو دیکھا۔ یہ سر کسی دھات کا بنا ہوا تھا۔

سر بھاری تھا مگر گردن پتلی تھی جو صندوق کے ڈھکنے کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ صندوق

میں بند پر اسرار لڑکے کی آواز آئی،  
 ”کسی پتھر سے بلی کا سر توڑ دو، ڈرو نہیں اس کا طلسم تمہیں کوئی نقصان نہیں  
 پہنچائے گا۔“

شنزاد نے جواب میں کہا:  
 ”میں مسلمان ہوں۔ اور مسلمان اللہ کے سوائے کسی سے نہیں ڈرتا۔ اگر تم  
 بھی کوئی جن بھوت ہو تو میں تمہارا بھی مقابلہ کروں گا۔“  
 صندوق میں سے آواز آئی:

”شلباش! مجھے کسی ایسے ہی دلیر اور بہادر لڑکے کی ضرورت تھی۔ اس  
 مصیبت سے تم ہی مجھے نجات دلا سکتے ہو۔“

شنزاد نے بلے کے ڈھیر پر سے ایک پتھر اٹھایا اور اللہ کا نام لے کر اسے طلسمی  
 بلی کے سر پر اتنے زور سے مارا کہ لوہے کا سر ڈھکن سے الگ ہو کر دور جاگرا۔ اس  
 کے ساتھ ہی ایک بھیانک چیخ کی آواز فضا میں گونج اٹھی۔ شنزاد ایک قدم پیچھے ہٹ  
 گیا۔ صندوق کا ڈھکنا ابھی بند ہی تھا کہ اس میں سے ایک شعلہ بلند ہوا۔ یہ شعلہ  
 صندوق سے الگ ہو کر لہراتا ہوا شنزاد کے بالکل سامنے آکر ساکت ہو گیا اور دوسرے  
 لمحے شعلے کی جگہ ایک دس بارہ سال کا کالے رنگ کا لڑکا کھڑا تھا نارچ کی روشنی میں اس  
 کی آنکھیں ہیروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس کے دونوں کانوں میں بالیاں تھیں۔  
 گھٹکریا لے سیاہ بالوں کے چھلے سر کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔ گلے میں چھوٹے سے  
 تلوے تعویذ والا لاکٹ پڑا تھا۔ اس نے ٹخنوں تک کالے رنگ کا چغہ پہن رکھا  
 تھا۔

شنزاد اسے تعجب سے دیکھ رہا تھا۔ چمکیلی آنکھوں والا عجیب و غریب لڑکا شنزاد  
 کی طرف دیکھ کر مسکرایا پھر اس نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھا کر شنزاد سے کہا،

”میرا نام ساپچی ہے۔ تم نے مجھے ایک اذیت ناک طلسم کی قید سے نجات دلائی ہے۔ اگر تم بہادری سے کام لے کر مجھے اس کی قید سے آزاد نہ کرتے تو میں قیامت تک اس صندوق میں بند رہتا۔ اب تم میرے دوست ہو۔ میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔“

شنزاد نے کہا: ”میرا نام شنزاد ہے اور میں.....“  
ساپچی نے مسکرا کر بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”میں جانتا ہوں تمہارا نام شنزاد ہے۔ تم شہر کے ایک اسکول میں دسویں جماعت میں پڑھتے ہو۔ تم بڑے نیک مسلمان لڑکے ہو۔ اسی لیے تمہارے اندر اتنی دلیری اور بہادری موجود ہے۔ ورنہ میری آواز سن کر لوگ ڈر کے مارے بھاگ جاتے تھے اور اب تو انہوں نے ادھر سے گزرتا بھی بند کر دیا تھا۔“

شنزاد نے ساپچی کی ہیرے کی طرح چمکتی ہوئی آنکھوں میں آنکھیں ڈال رکھی تھیں۔

”لیکن تم کون ہو؟“

ساپچی بولا۔ ”میں ایک جن کا بیٹا ہوں۔ مگر مسلمان جن کا بیٹا ہوں۔ میرا باپ جادوگر سامری سے مقابلہ کرتے ہوئے چل بسا تھا۔ میں فرار ہو گیا۔ لیکن سامری نے مجھے پکڑ لیا اور اپنے طلسم کی مدد سے اس لوہے کے صندوق میں بند کر دیا۔ اگر تم میری مدد نہ کرتے تو میں کبھی اس قید سے آزاد نہیں ہو سکتا تھا۔ تم نے مجھ پر احسان کیا ہے۔ میں جانے سے پہلے اس احسان کا بدلہ چکانا چاہتا ہوں۔ بتاؤ تمہاری کیا خواہش ہے۔ میں تمہاری صرف ایک خواہش پوری کر سکتا ہوں۔ تم اگر کہو تو میں اس شہر میں تمہارے لیے ابھی ایک شاندار محل بنا دوں۔ تمہارے قدموں میں سونے چاندی ہیرے جواہرات کے ڈھیر لگا دوں مگر تمہیں صرف ایک خواہش کرنی

ہو کی۔“

شہزاد نے جواب دیا،

”میرے پاس ایمان کی دولت ہے۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔“  
 سانچی نے کہا، ”ایک بار پھر سوچ لو۔ میں جا رہا ہوں۔ پھر شاید کبھی تم سے ملاقات نہ ہو۔ یہ موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔“

اچانک شہزاد کے دل میں ایک خیل آیا۔ اس نے سانچی کی طرف دیکھا اور کہا، ”سانچی! کیا تم مجھے تاریخ اسلام کے نامور اور عظیم مسلمان حکماء، جغرافیہ دانوں اور سائنس دانوں سے ملوا سکتے ہو؟ میری بڑی خواہش ہے کہ میں ان عظیم مسلمان سائنس دانوں اور طبیبوں کے زمانے میں پہنچ کر انھیں دیکھوں۔ ان سے باتیں کروں۔ ان کی باتیں سنوں اور انھیں وہ تاریخی تجربات کرتے دیکھوں کہ جن سے آج یورپ کی قومیں فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ مثلاً ابن سینا، امام الرازی، جابر بن حیان اور ایسی ہی دوسری نامور مسلمان ہستیاں جن کے نام اسلامی تاریخ میں چاند ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں۔ کیا تم مجھے ان سے ملوا سکتے ہو؟ میں ان عظیم ہستیوں سے بھی ملنا چاہتا ہوں جنہوں نے اس دور میں ہمیں اپنے اسلاف کے کارناموں سے روشناس کرایا ہے اور اسلامی یونانی طب کی اعلیٰ روایات کو زندہ کیا ہے۔“

سانچی ایک پل کے لیے جیسے کچھ سوچنے لگا۔ پھر مسکرایا اور بولا،  
 ”یہ کام میرے لیے مشکل تو نہیں ہے، لیکن تمہارے لیے اس میں خطرہ ضرور ہے اور میری جان کو بھی خطرہ ہوگا۔ اپنی جان کا خطرہ مجھے اس لیے قبول کرنا پڑے گا کہ میں تمہاری ایک خواہش کو پورا کرنے کا قول دے چکا ہوں۔ لیکن تمہاری جان کی مجھے ضرور فکر ہے۔ تمہاری بہادری اور ایمان کی پختگی سے متاثر ہو کر میں نے تمہیں اپنا دوست بنا لیا ہے اور نہیں چاہتا کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچے۔ بہتر



یہ ہے کہ تم کوئی اور خواہش کرو۔

شہزاد نے نفی میں سر بلایا اور کہا،

”میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میری اور کوئی خواہش نہیں ہے بس یہی ایک خواہش ہے اور تم میری ایک خواہش پوری کرنے کا وعدہ کر چکے ہو۔“

ساچی چپ ہو گیا۔ شہزاد نے پوچھا،

”آخر تمہاری جان کو اس میں کیا خطرہ ہے؟“

ساچی نے جواب دیا۔

”مسلمان سائنس دانوں سے تمہیں ملوانے کے لیے مجھے تاریخ کے پرانے زمانے میں جانا ہو گا۔ پھر مجھے اس دور میں واپس آکر ان نامور ہستیوں سے تمہیں ملانا ہو گا جنہوں نے طب اسلامی کو پھر سے زندہ کیا ہے۔ میرے دشمن سامری جادوگر کی بدروح بھی پرانے زمانے میں ہی رہتی ہے۔ اس کو فوراً پتا چل جائے گا کہ میں آزاد ہو گیا ہوں۔ وہ مجھے دوبارہ پکڑنے اور ہلاک کرنے کی کوشش کرے گا اور ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں بھی نقصان پہنچائے کیونکہ تم نے ہی مجھے اس کے طلسم سے آزاد کرایا ہے۔“

شہزاد نے دیر سے کہا:

”میں تو سامری سے نہیں ڈرتا۔ اگر تم ڈرتے ہو تو ٹھیک ہے۔ میں اپنی خواہش واپس لیتا ہوں۔“

اس پر ساچی نے سر اٹھا کر بڑی شان سے کہا:

”میں ایک مسلمان جن کا بیٹا ہوں میں بھی موت سے نہیں ڈرتا۔ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہیں تاریخ اسلام کے عظیم الشان سائنس دانوں سے ضرور ملواؤں گا۔“

شنزاد بڑا خوش ہوا۔ اس نے پوچھا۔

”لیکن سانچی! ہم پرانے زمانے میں کیسے جائیں گے؟“

سانچی بولا۔ ”پرانے زمانے میں لے جاتا میرا کام ہے۔ تم اس طرح چلتے پھرتے جاگتی حالت میں میرے ساتھ آج سے سلت آٹھ سو برس پہلے کے تاریخی زمانے میں نہیں جاسکو گے۔“

”تو پھر میں کیسے جاؤں گا؟“ شنزاد نے سوال کیا۔

سانچی نے کہا، ”میں تمہیں خواب کی حالت میں اپنے ساتھ لے جایا کروں گا۔“

”کیا مطلب؟“ شنزاد چونکا۔

سانچی مسکرایا۔ ”دوست! جب تم رات کو اپنے بستر پر لیٹنے کے بعد سو جاؤ گے تو میں تمہارے خواب میں آؤں گا اور تمہارا ہاتھ پکڑ کر تمہیں اس دنیا سے نکال کر اسلام کے سنہری تاریخی دور میں لے جاؤں گا۔ تم ہر بار کسی ایک نامور مسلمان سائنس دان سے ملو گے۔ انہیں کام کرتے، درس دیتے اور تجربے کرتے چلتے پھرتے باتیں کرتے دیکھو گے اور پھر میں تمہیں واپس خواب میں ہی تمہارے بستر پر لے آؤں گا۔“

شنزاد نے کہا، ”اس کا مطلب ہے کہ جتنی دیر تک میں پرانے زمانے میں رہوں گا اتنی دیر تک میں بستر پر سوتا رہوں گا۔“

”ہاں۔ تم گہری نیند سو رہے ہو گے۔“ سانچی نے کہا۔

شنزاد نے تشویش کے ساتھ کہا، ”لیکن اگر اس دوران گھر میں کسی نے

مجھے جگا دیا تو پھر کیا ہو گا؟ کیا میں پرانے زمانے سے ایکدم واپس آ جاؤں گا؟“

سانچی بولا۔ ”نہیں۔ تم اس وقت تک واپس اپنے سوئے ہوئے جسم میں

نہیں آؤ گے جب تک کہ میں تمہیں خود تمہارا ہاتھ پکڑ کر نہیں لاؤں گا۔ اس دوران گھر میں پیچھے کوئی تمہیں لاکھ جگائے۔ تمہارے سرہانے ڈھول بجائے تم سوتے رہو گے۔“

شہزاد نے کہا، ”اس کا مطلب ہے کہ میرا یہ سفر خواب کی طرح ہو گا اور مجھے بعد میں ہر چیز واقعہ یا خواب کی طرح دھندلا دھندلا ہی یاد رہے گا“

ساہی نے کہا، ”نہیں۔ اگرچہ تم خواب میں سفر کرو گے اور تاریخ کے پرانے نامور لوگوں سے ملاقاتیں کرو گے، لیکن تمہیں ایسا ہی محسوس ہو گا کہ تم زندہ اور جاگتی حالت میں چل پھر رہے ہو اور بعد میں تمہیں ان کی ایک ایک بات یاد رہے گی۔ لیکن ایک شرط ضرور ہے۔“

”وہ کیا؟“ شہزاد نے پوچھا۔

”وہ یہ“ ساہی نے کہا، ”کہ صبح کو جب تم جاگو گے تو کسی سے اس کا ذکر نہیں کرو گے کہ تم نے رات ابن سینا یا امام رازی یا البیرونی سے ملاقات کی ہے۔ یہ راز تمہارے سینے میں راز بن کر ہی رہے گا۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں صبح اٹھ کر کسی سے اس کا ذکر نہیں کروں گا۔“ شہزاد نے پوری ذمہ داری سے کہا، ”لیکن ساہی میرے دوست! خواب میں کئی دن بلکہ کئی مہینے بھی لگ سکتے ہیں۔“

ساہی بولا، ”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ انسان خواب میں کئی کئی سال گزار رہتا ہے اور جب جاگتا ہے تو صرف ایک رات گزری ہوتی ہے۔“

شہزاد نے کہا، ”کیا ہر رات تم مجھے خواب میں آکر لے جایا کرو گے؟ میرا مطلب ہے کہ میں خواب میں کس جگہ تمہارا انتظار کیا کروں گا؟“

ساہی نے اپنے گلے سے لاکٹ والا تعویذ اتار کر شہزاد کو دیا اور کہا، ”اس تعویذ

کو اپنے گلے میں ڈال لو۔ اس سے تمہارا اور میرا رابطہ قائم رہے گا۔ اگر اللہ نہ کرے کسی وقت ہم اپنے پر خطر سفر میں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے اور تم پر کوئی آفت آن پڑی تو اس تعویذ پر ہاتھ رکھ کر مجھے زور سے سانچی! سانچی! کہہ کر تین بار آواز دینا۔ میں جہاں بھی ہوں گا تمہاری مدد کو آ جاؤں گا۔ ویسے تو میں اس سفر میں تمہارے ساتھ ہی ہوں گا۔ لیکن اپنے دشمن سامری جادوگر سے خطرہ ہے۔ وہ ضرور مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ بہر حال جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ ہم کل رات اللہ کا نام لے کر اپنے تاریخی سفر کی ابتدا کریں گے۔“

شہزاد نے تعویذ اپنے گلے میں ڈال لیا۔ یہ تعویذ ایک چھوٹے سے چاندی کے لاکٹ میں بند تھا۔ سانچی بولا۔

”گھر میں یا اسکول میں کسی کو مت بتانا کہ یہ تعویذ میں نے تمہیں دیا ہے۔ کسی سے میرے بارے میں بھی بات نہ کرنا کہ تم نے باؤلی کے آسیب کو آزاد کر دیا ہے۔ تعویذ کے بارے میں گھر میں کوئی پوچھے تو نہ دینا کہ ایک فقیر نے دیا ہے۔ بس اس سے آگے کسی کو کچھ نہ بتانا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں کل رات تمہارے خواب میں آؤں گا۔“

اس کے ساتھ ہی سانچی غائب ہو گیا۔ شہزاد نے چاروں طرف ٹلچ کی روشنی ڈالی، مگر سانچی وہاں نہیں تھا۔ شہزاد کو اس بات کی بڑی خوشی تھی کہ وہ کل سے اپنے ایڈونچر سے بھرپور تاریخی سفر پر روانہ ہو گا اور اس کی اسلام کی عالی شان شخصیتوں اور نامور مسلمان سائنس دانوں، طبیبوں، جغرافیہ دانوں اور فلسفیوں سے نہ صرف ملاقات ہوگی بلکہ وہ انہیں زندہ حالت میں اپنے زمانے میں چلتے پھرتے باتیں کرتے اور کلام کرتے دیکھے گا۔ وہ زینہ چڑھ کر باؤلی سے نکل آیا۔ اس وقت آسمان پر بادل تو اسی طرح چھائے ہوئے تھے مگر بوند باندی رک گئی تھی۔



رات اسی طرح تاریک تھی۔ بارہ دری کا کھنڈر اندھیری رات میں اپنا دھندلا سے خاکہ ہی پیش کر رہا تھا۔ سردی زیادہ ہو گئی تھی۔ شہزاد کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی ایک جن ساپنجی سے دوستی ہو گئی ہے اور وہ اسے اسلامی تاریخ کے سنہری زمانوں کی سیر کروانے والا ہے۔ اگرچہ یہ جن لڑکا تھا، اس کا تقریباً ہم عمر تھا اور مسلمان تھا لیکن تھا تو وہ جن ہی..... شہزاد کو اندر ہی اندر بڑی خوشی کا احساس ہو رہا تھا کہ کل رات وہ خواب میں ایک انوکھے اور حیرت انگیز تاریخی سفر پر نکلنے والا ہے۔ اس نے ٹارچ اپنی بر سلتی کی جیب میں ڈالی اور تیز قدموں سے اپنی کوٹھی کی طرف چلنے لگا۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ گھر میں کوئی جاگ کر اس کے کمرے میں نہ آ گیا ہو۔ اس کا بستر خالی تھا۔ اس نے سوچ لیا کہ اگر ابو یا امی کسی نے پوچھا کہ وہ اتنی رات گئے بارش میں اٹھ کر کہاں چلا گیا تھا تو وہ کہہ دے گا کہ اسے باہر کھنکا لگا تھا اور وہ یہ دیکھنے باہر گیا تھا کہ کہیں کوئی چور تو نہیں آ گیا۔ مگر خیریت ہی رہی۔ پیچھے کسی کو خبر نہ ہوئی تھی۔ وہ چپکے سے دبے پاؤں اپنے کمرے میں آ گیا بر سلتی وغیرہ اتار کر ایک طرف پھینکی اور جلدی سے بستر میں گھس گیا۔ لحاف گردن کے اوپر کرتے ہوئے اس کا ہاتھ ساپنجی کے دبے ہوئے تعویذ کے لاکٹ سے چھو گیا۔ اس نے خوشی سے آنکھیں بند کر لیں۔ کاش ساپنجی آج رات ہی خواب میں آ کر اسے اسلامی تاریخ کے سنہری دور میں لے جائے۔

مگر ساپنجی دوسری رات آنے والا تھا۔

# کیا طلالہ چڑیل تھی؟

صبح کو شنزاد کی امی کی نظر اس کے گلے میں پڑے ہوئے تعویذ پر پڑی تو انہوں نے

پوچھا۔

”شنزاد! یہ تعویذ تمہارے گلے میں کہاں سے آگیا؟“

شنزاد نے فوراً جواب دیا۔

”اتنی جان! میں آپ کو بتانا ہی بھول گیا۔ کل ہمارے اسکول کی مسجد میں ایک بزرگ تشریف لائے تھے۔ انہوں نے مجھے یہ تعویذ دے کر کہا تھا بیٹا اسے اپنے گلے میں ڈالے رکھنا۔ اس سے برکت ہوگی۔“ شنزاد کے ابو بھی آرام کرسی پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے اخبار ہٹا کر تعویذ کی طرف دیکھا اور کہا،  
”دیکھو تو۔“

شنزاد نے تعویذ اتار کر ابو جان کو دیا۔ تعویذ چھوٹا چاندی کا بٹن لگتا تھا۔ اس پر بدال کا نشان کھدایا ہوا تھا۔ شنزاد کا بڑا بھائی اور بڑی بہن بھی وہاں آگئی اور تعویذ کا جائزہ لینے لگے۔  
ابو نے کہا،

”ہٹوا اسے۔ بد نما تعویذ لے کر گلے میں نہیں ڈالا کرتے۔ اللہ جانے اس میں کیا

ہے۔“

شنزاد نے منہ نہ بنا کر کہا،

”ٹھیک ہے ابو میں کل یہ تعویذ ان بزرگ کو واپس کر دوں گا۔ وہ مسجد میں آتے رہتے ہیں۔“

امی بولیں، ”اب واپس کرنا اچھا نہیں لگتا۔“

”بڑی بہن نے کہا، ”اسے کسی الماری میں رکھ چھوڑو۔ گلے میں مت پہنو۔“

”ہاں اپنی الماری میں رکھ دو۔“ بڑے بھائی نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ شنزاد نے تعویذ کو ایک ڈبیا میں بند کر کے اپنی کتابوں کی الماری میں سنبھال کر رکھ دیا۔ دل میں یہ خیال کرتے ہوئے کہ رات کو سونے سے پہلے وہ اسے گلے میں پہن لے گا۔ کیونکہ سانچی نے کہا تھا کہ خواب میں سفر کرنے کے واسطے اس کا گلے میں ہونا ضروری ہے۔

شنزاد اسکول آگیا۔ اسکول میں اس کا ایک خاص دوست شہد تھا۔ شنزاد کا بڑا دل چاہا کہ وہ شہد کو بتا دے کہ اس کی دوستی سانچی نامی ایک جن سے ہو گئی ہے اور اب وہ ہر رات اسلامی تاریخ کے زمانے میں سیر کرنے اور مسلمان سائنس دانوں اور دانشوروں سے ملنے جایا کرے گا۔ اسے سانچی کو دیا ہوا قول یاد آگیا کہ خبردار اس بات کا ذکر کسی سے نہ کرنا اور اسے راز رکھنا۔ شنزاد نے خواہش کے باوجود اپنے دوست شہد کو کچھ نہ بتایا۔ اسکول سے چھٹی کے بعد شنزاد گھر آگیا۔ اسے بڑی بے صبری سے رات کا انتظار تھا۔ کسی وقت اسے لگتا کہ جیسے اس نے کل بدش والی رات میں بھی ایک خواب ہی دیکھا تھا اور کوئی سانچی جن اس کا حقیقت میں دوست نہیں ہے اور صدیوں گزرے زمانے میں جا کر نامور مسلمان سائنس دانوں سے ملنے کا خیال محض ایک خواب ہی ہے۔ مگر جب اسے سانچی کے دیے ہوئے تعویذ کا خیال آیا جو صبح وہ اپنے ہاتھوں سے الماری میں بند کر کے آیا تھا تو اسے ایک بد پھر یقین ہو گیا کہ نہیں وہ خواب نہیں تھا بلکہ حقیقت تھی اور وہ آج رات ایک عجیب و غریب اور

ایڈونچرس سفر پر نکلنے والا ہے۔

وہ دعا مانگنے لگا کہ یا اللہ جلدی سے رات آجائے مگر رات کو تو اپنے وقت پر آنا تھا۔ عشاء کی نماز کے بعد شہزاد نے گھر والوں کے ساتھ مل کر کھانا کھایا اور اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ اس وقت دیوار پر لگا ہوا گھنٹہ رات کے ساڑھے نو بج رہا تھا۔ دوسرے کمرے سے نیلے ویرن پر خبرنامے کے بند ہونے کے ساز کی آواز آرہی تھی۔ شہزاد نے جی گل کر دی۔ سردی کافی تھی۔ اس نے سونے سے پہلے المدی میں سے سانچی کا تعویذ نکال کر گلے میں پہن لیا تھا۔ کمرے میں جی بجھانے سے اندھیرا ہو گیا تھا۔ شہزاد نے آنکھیں بند کر لیں اور بے چینی سے نیند کا انتظار کرنے لگا۔ پہلے اسے آنکھیں بند کرنے کے تھوڑی دیر بعد ہی نیند آ جاتی تھی مگر اب کافی دیر گزر گئی مگر اسے نیند نہ آئی۔ وہ پریشان ہو گیا کہ اگر اسے نیند نہ آئی تو اس کا جن دوست سانچی اسے ساتھ لے کر تاریخ اسلام کے عہد میں کیسے جائے گا۔ وہ دل میں دعائیں مانگنے لگا کہ اللہ میں مجھے جلدی سے نیند آجائے۔ تھوڑی دیر میں اس پر غنودگی چھانے لگی اس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ رات کا وقت ہے۔ آسمان پر چاند نکلا ہوا ہے۔ چاروں طرف چاندنی پھیلی ہے۔ وہ آسیبی باؤلی والی بارہ دری کے پاس کھڑا ہے جہاں سانچی نے اس سے آنے کا وعدہ تھا۔ ابھی اسے وہاں کھڑے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ باؤلی کی طرف جاتے تاریک زینے میں روشنی ہوئی اور پھر سانچی اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس نے وہی کالا چغہ پہن رکھا تھا۔ سیاہ گھنگریالے بالوں کے گچھنے سر کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔ کانوں میں بالیاں تھیں۔ آنکھوں میں ہیروں کی چمک تھی جن میں سے کرنیں نکل رہی تھیں۔ سانچی نے کہا:

”میں نے وعدہ کیا تھا۔ میں آگیا۔ کیا تم میرے ساتھ تاریخی سفر پر چلنے کو تیار

ہو؟“

سانچی نے شہزاد کے چہرے پر آنکھیں جماتے ہوئے کہا:



”ایک بار پھر سوچ او شہزاد۔ اس سفر میں بڑے خطرے آئیں گے۔ میرا تئیارا ساتھ چھوٹ بھی سکتا ہے۔ اور میرے بغیر تم اکیلے اس سفر میں بھٹک کر نہیں آ سکتے ہو۔“

شہزاد نے گردن اٹھا کر کہا، ”میں اپنے عظیم بزرگوں کو ایک نظر دیکھنے کی خاطر بڑے سے بڑا خطرہ مول لے سکتا ہوں۔“ سانچی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”شلباش! تم ایک بہادر لڑکے ہو۔ مجھے تم سے یہی امید تھی۔“

شہزاد نے ساتھ ہی کہا، ”مگر سانچی مجھے اس بات کی فکر ہے کہ تئیارا دشمن جادوگر سامری تمہارے پیچھے لگ جائے گا۔ کیونکہ وہ بھی پرانے زمانے میں ہی رہتا ہے اور تئیارا جان کا دشمن ہے۔ کہیں وہ تمہیں نقصان نہ پہنچائے۔“ سانچی نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا:

”اللہ مالک ہے۔ تم سے جو وعدہ کیا ہے اسے ضرور پورا کروں گا۔ اب تم ہر رات اس طرح میرے ساتھ اس تاریخی سفر پر نکلا کرو گے۔ میرا ہاتھ تھام لو۔“

شہزاد نے سانچی کا ہاتھ تھام لیا۔ سانچی نے کہا، ”اپنی آنکھیں بند کر لو۔“ شہزاد نے آنکھیں بند کر لیں، ”لیکن ذرا ٹھیرو“ سانچی نے آنکھیں کھول کر کہا، ”میں دو ایک ضروری باتیں بتانا بھول گیا ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس تاریخی مگر خطرناک سفر میں میرا دیا ہوا تعویذ اپنے گلے سے الگ مت کرنا۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہاں سے سات آٹھ سو سال پیچھے کے زمانے میں جاتے ہوئے تمہیں ایک جھٹکا سا ضرور لگے گا۔ مگر میرا ہاتھ مت چھوڑنا اگر ہاتھ چھوٹ گیا تو میں تم سے الگ ہو جاؤں گا اور تمہیں پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔“ شہزاد نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔

”تم فکر نہ کرو سانچی! میں ان دونوں باتوں کا خیال رکھوں گا۔“

سانچی بولا، ”ایک اور بات۔ اگر تم مجھ سے الگ بھی ہو جاؤ تو میرے دیے ہوئے۔“

تعویذ کے لاکٹ پر ہاتھ رکھ کر تین بار میرا نام پکارتا۔ اس تعویذ کی کشش مجھے تیار سے پاس کھینچ لائے گی۔ اب آنکھیں بند کر لو۔“

شنزاد نے آنکھیں بند کر لیں۔ اچانک شنزاد کو اپنا جسم گرم ہوتا محسوس ہوا۔ جیسے کسی نے اس کو آگ کے پاس کھڑا کر دیا ہو۔ وہ کچھ گھبرایا۔ پہلا پہلا تجربہ تھا۔ اس کا دل بھی بری طرح دھڑکنے لگتا تھا۔ اچانک اسے ایک جھٹکا لگا اور اس کے ہاتھ سے سانچی کا ہاتھ چھٹ گیا۔ آخر وہی ہوا جس کا شنزاد کو دھڑکا لگا تھا۔ سانچی اس سے الگ ہو گیا تھا۔ مگر اسے اطمینان تھا کہ تعویذ اس کے گلے میں ہی ہے اور وہ اس پر ہاتھ رکھ کر سانچی کو اپنے پاس واپس بلائے گا۔ شنزاد کی آنکھیں بند تھیں۔ اسے لگتا تھا کہ وہ نیچے ہی نیچے اترتا چلا جا رہا ہے۔ ایک دم سے اس کے پاؤں زمین سے ٹکرائے اور اس نے اپنے جسم کو زمین پر گرتے محسوس کیا۔ اس کے بعد اسے کوئی ہوش نہ رہا۔

شنزاد ایک جنگل میں ظاہر ہوا تھا۔ یہ جنگل سنسان تھا۔ شنزاد زمین پر بے ہوش پڑا تھا۔ وہ اپنے ساتھی اور دوست جن سانچی سے بچھڑ گیا تھا۔ سانچی کا دیا ہوا تعویذ والا لاکٹ اس کے گلے میں ہی تھا، مگر شنزاد کو کوئی ہوش نہیں تھا۔ اس کی بے ہوشی کی وجہ یہ تھی کہ اس کے زندہ جسم کو ایک دم سے سات آٹھ سو سال پیچھے ماضی کی طرف سفر کر کے جانے کا پہلے تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اس حقیقت کا ابھی تک شنزاد کو علم نہیں ہوا تھا کہ وہ آٹھ سو سال پرانے زمانے میں داخل ہو چکا ہے اور ملک شام کے علاقے میں ہے جہاں اس وقت مسلمان عباسی بادشاہ خلیفہ المقتدر کی حکومت تھی اور عظیم مسلمان سائنس دان طبیب اور فلسفی، حکیم ابو بکر محمد بن زکریا رازی بغداد کے سب سے بڑے ہسپتال کا ناظم یعنی انچارج تھا۔ شنزاد نے سب سے پہلے حکیم رازی سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی اور سانچی نے اسے حکیم رازی کے زمانے میں پہنچا دیا تھا مگر شنزاد بد قسمتی سے اپنی گھبراہٹ کی وجہ سے سانچی سے جدا ہو گیا تھا۔ وہ جنگل میں درختوں کے نیچے بے ہوش پڑا تھا۔ درخت بڑے عجیب و غریب

تھے۔ ان کی شہنیاں کانٹوں سے بھری ہوئی تھیں۔ وہ کالے کالے تھے دوپہر کا وقت تھا مگر درختوں پر ایک بھی پرندہ نہیں بیٹھا تھا۔ ایک طرف سے دو آدمی گھوڑے دوڑاتے آئے اور شہزاد کے پاس آکر رک گئے۔ ان کا لباس پرانے زمانے کے بغداد کے لوگوں کا تھا۔ وہ غور سے شہزاد کو دیکھنے لگے۔ ایک بولا، ”اس کا لباس کس قسم کا ہے۔ یہ ملک روم کا نیسلانی لگتا ہے۔“ کیوں کہ شہزاد نے پتلون اور قمیص پہن رکھی تھی۔ رات کو وہ پاجامہ کرتا پہن کر سوتا تھا مگر چونکہ اسے اس رات تاریخی سفر پر نکلنا تھا اس لیے وہ پتلون قمیص پہن کر سویا تھا۔

ایک سوار گھوڑے سے اتر کر شہزاد کو جھک کر دیکھنے لگا۔ دوسرے سوار نے گھبراہٹ سے آواز میں کہا،

”کیوں وقت ضائع کر رہے ہو۔ شام ہونے والی ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ اس جنگل میں شام کو طلالہ نام کی ایک چڑیل نکلتی ہے جو اسے دیکھتا ہے درخت بن جاتا ہے۔“

اس کا ساتھی شہزاد کے گلے میں پڑے ہوئے تعویذ کو دیکھ کر بولا۔ ”یہ تعویذ قیمتی معلوم ہوتا ہے۔ اسے بغداد میں جا کر بیچ دیں گے۔“

پہلے گھوڑا سوار نے کہا، ”بے چارہ کوئی مسافر لڑکا ہے۔ اس کا تعویذ اس کے گلے میں پڑا رہے دو۔“ مگر دوسرے گھوڑا سوار نے تعویذ شہزاد کی گردن سے نکل کر اپنے لیے کرتے کی جیب میں رکھ لیا۔ اور گھوڑے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”تم چپ رہو۔ چلو بھاگو۔ جنگل میں شام ہو گئی تو طلالہ چڑیل ہمیں درخت بنا دے گی۔“

دونوں گھوڑا سوار گھوڑے دوڑاتے جنگل میں غائب ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد شہزاد کو ہوش آگیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک اجڑا سنسان جنگل میں پڑا ہے۔ سانچی اس کے پاس نہیں

ہے۔ اس کا ہاتھ فوراً اپنے آپ گلے کی طرف گیا تاکہ سانچی کو آواز دے۔ لیکن تعویذ غائب تھا۔ وہ جلدی سے اٹھا اور تعویذ کو تلاش کرنے لگا کہ شاید زمین پر گرتے وقت اس کے گلے سے نکل کر کہیں گر پڑا ہو۔ وہ درختوں کے نیچے تعویذ تلاش کر رہا تھا کہ ایک لکڑہار اس کے پاس آیا اور بولا،

”لڑکے تمہیں پتا نہیں شام ہونے والی ہے؟ تم یہاں کیا ڈھونڈ رہے ہو؟“

شنزاد نے کہا، ”میرے گلے کا تعویذ گم ہو گیا ہے۔“

لکڑہار بولا، ”تم اپنا تعویذ تلاش کرتے رہو گے اور شام ہو جائے گی اور طلالہ چڑیل

تمہیں آدمی سے درخت بنا دے گی۔“

شنزاد نے لکڑہارے کی طرف دیکھا۔

”یہ طلالہ چڑیل کہاں سے آگئی؟“

لکڑہارے نے کہا، ”ابھی آئی نہیں۔ شام کو آئے گی۔ تم پر وہی لگتے ہو۔ جب

ہی تمہیں یہ معلوم نہیں کہ یہ جنگل آسیبی ہے ہر شام کو یہاں ایک چڑیل جس کا نام طلالہ

ہے آتی ہے اور جو بھی مرد یا عورت اسے نظر آتی ہے اسے وہیں درخت بنا ڈالتی ہے۔ اس

جنگل کے آدھے درخت پہلے انسان تھے۔“

شنزاد نے کہا،

”میں کسی چڑیل وڑیل کو نہیں مانتا بھائی تم اپنا راستہ لو۔“

لکڑہار لڑکے کی بے وقوفی پر افسوس کرتا ہوا چلا گیا۔ شنزاد سخت پریشان تھا کہ اس کا

تعویذ غائب ہو گیا ہے۔ وہ اسی نتیجے پر پہنچا کہ جب وہ بے ہوشی کی حالت میں جنگل میں پڑا تھا تو

کوئی تعویذ اس کے گلے سے اتار کر لے گیا ہے۔ اب کیا کروں؟ شنزاد نے اپنے آپ سے

سوال کیا۔ پھر خود ہی اس سوال کا جواب دیتے ہوئے اپنے آپ سے بولا۔ میرا خیال ہے

مجھے کچھ دیر اسی جگہ بیٹھے رہنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ سانچی بھی اس طرف نکل آئے۔ وہ



ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے اندر دو تبدیلیاں محسوس کی تھیں۔ پہلی یہ کہ نہ اسے بھوک کا احساس ہو رہا تھا نہ پیاس کا۔ دوسری تبدیلی اس نے یہ محسوس کی کہ اس کی زبان عربی ہے۔ لکڑہارے سے اس نے عربی زبان میں ہی بات کی تھی۔ تعویذ کی پریشانی کی وجہ سے وہ لکڑہارے سے یہ بھی نہ پوچھ سکا تھا کہ یہ کون سا ملک ہے اور کون سا زمانہ ہے۔

دن ڈھل رہا تھا۔ درخت بڑے ڈراؤنے تھے۔ ان کی ٹہنیاں کانٹوں سے بھری ہوئی تھیں۔ شہزاد سوچنے لگا یہ کس قسم کے درخت ہیں اتنے میں ایک چرواہا اپنی بکریوں کو لیے وہاں سے گزرا۔ شہزاد کو دیکھ کر بولا:

”لڑکے یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ معلوم نہیں شام ہونے والی ہے اور طلالہ چڑیل کے نکلنے کا وقت آگیا ہے۔“

شہزاد نے پوچھا، ”یہ کون سا ملک ہے بھائی؟“

اب چرواہا بھی بہت حیران ہوا۔ کہنے لگا،

”تم اس جنگل میں بیٹھے ہو اور تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ کون سا ملک ہے۔

تم کہاں کے رہنے والے ہو، تمہارا لباس بھی عجیب ہے، کیا تم عیسائی مذہب کے ماننے والے ہو؟“

شہزاد بولا، ”ہاں۔ میں۔ میں ملک روم کا رہنے والا ہوں۔ میرا دشمن مجھے بے

ہوش کر کے یہاں پھینک گیا ہے۔ یہ کون سا ملک ہے بھائی؟“

چرواہے نے کہا، ”یہ ملک عراق ہے اور یہاں مسلمان خلیفہ المقتدر کی حکومت

ہے۔ تم بغداد شہر سے پچاس فرسنگ دور شب تار کے جنگل میں ہو۔ یہ جنگل دن کے وقت

ٹھیک رہتا ہے، مگر جوں ہی رات ہوتی ہے آبی جنگل بن جاتا ہے۔ پھر ایک چڑیل کہیں سے

نمودار ہوتی ہے۔ وہ مسافر کو آواز دیتی ہے جو اس کی طرف دیکھتا ہے وہ درخت بن جاتا ہے۔

یہاں کے سبھی لوگ جانتے ہیں کہ اس جنگل کے آدھے درخت پہلے انسان تھے، مگر چڑیل طلالہ کی طرف دیکھ کر درخت بن گئے۔“

شنزاد کے دل میں ایک ہلکا سا شک پیدا ہوا کہ کہیں جج جج یہاں کوئی چڑیل انسانوں کو درخت نہ بنا دیتی ہو۔ مگر اس نے اس خیال کو جھٹک دیا۔ یہ خیال اس کے شعور سے نکل کر تحت الشعور یعنی شعور کے نچلے خانے میں جا کر بیٹھ گیا۔ جو خیال آدمی کے شعور سے نکل کر شعور کے نچلے خانے میں جا کر بیٹھ جاتا ہے وہ وہیں بیٹھا انسان پر اپنا اثر ڈالتا رہتا ہے مگر آدمی کو اس کا پتا نہیں چلتا۔ یہ خیال شنزاد کے شعور کے نچلے خانے میں جا کر بیٹھ گیا تھا کہ اس جنگل میں طلالہ نام کی ایک چڑیل آتی ہے اور جو اسے دیکھے وہ درخت بن جاتا ہے۔ اسی لیے اسلام ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ہمیں ہمیشہ اچھی بات سوچنی چاہیے۔ اچھی بات سنی چاہیے تاکہ اگر کوئی خیال ہمارے شعور سے نکل کر تحت الشعور کے نچلے خانے میں جا کر بیٹھ جائے تو وہ وہاں سے جسم پر اچھا اثر ہی ڈالے برا اثر نہ ڈال سکے۔ کیونکہ خیال اچھا پاکیزہ اور نیک ہو گا تو وہ ہر حالت میں انسان پر اچھا اثر ہی ڈالے گا۔

چرواہا آگے بڑھنے لگا تو شنزاد نے پوچھا۔

”بھائی ایک بات تو بتاؤ۔ کیا بغداد شہر میں حکیم رازی نام کا کوئی مسلمان طبیب بھی رہتا ہے۔“

چرواہے نے کہا، ”تم ابو بکر محمد بن زکریا رازی کی بات تو نہیں کر رہے لوگ؟“

شنزاد جلدی سے بولا، ”ہاں ہاں۔ میں انھی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔“

چرواہا بولا، ”وہ تو اس زمانے کے سب سے بڑے طبیب اور عالم ہیں۔ وہ بغداد میں ہی رہتے ہیں۔ خلیفہ المقتدر کے اسپتال کے ناظم ہیں اور مدرستہ الحکمت میں طالب علموں کو درس بھی دیتے ہیں، مگر بھائی یہاں سے جتنی جلدی ہو سکے نکل جاؤ۔ شام ہو گئی تو چڑیل

طلالہ تمہیں بھی درخت بنا دے گی۔ تمہیں اس جنگل سے نکلنے نکلنے بھی شام ہو جائے گی۔“

یہ کہہ کر چرواہا چل دیا۔ شہزاد کو یہ سن کر بہت ہی خوشی ہوئی کہ وہ نہ صرف یہ کہ اسلامی تاریخ کے سنہری دور میں پہنچ گیا ہے بلکہ جس بغداد شہر میں عکیم الرازی درس دیتے ہیں وہ اس شہر سے تھوڑے فاصلے پر ہی ہے۔ ایک بار پھر اسے ساپنی کا خیال آگیا۔ ساپنی کے خیال کے ساتھ اسے اپنے تعویذ کا خیال آگیا۔ وہ سوچنے لگا تعویذ نہ ملا تو کیا ہو گا؟ میں تو اس دنیا سے کبھی واپس نہ جاسکوں گا۔ یہ سوچ سوچ کر شہزاد کا ذہن بہت پریشان ہو گیا۔ اس نے بے اختیار ساپنی کو آواز دی، ”ساپنی! ساپنی! میرے دوست تم کہاں ہو؟ میری آواز سن رہے ہو تو میرے پاس آ جاؤ۔ میں تمہارے بغیر سخت پریشان ہوں۔“ لیکن اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ شہزاد تعویذ پہ ہاتھ رکھ کر آواز دیتا تو ساپنی فوراً حاضر ہو جاتا۔

اس نے سوچا کہ چلو بغداد شہر کو چلتے ہیں اور اس تاریخی شہر کی سیر کرتے ہیں شاید وہاں ساپنی سے بھی ملاقات ہو جائے۔ یہ شہزاد کا پہلا سفر تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ تعویذ کے بغیر ساپنی کی حالت میں بھی اس کے پاس نہیں آ سکتا تھا۔ وہ درختوں میں ایک طرف چل پڑا۔ چلتا گیا۔ چلتا گیا۔ جنگل ختم ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔ اس کے تحت الشعور یعنی شعور کے نچلے حصے میں بیٹھے ہوئے چڑیل کے خیال کا اثر ظاہر ہونے لگا تھا۔ کسی وقت اچانک اسے وہم سا ہوتا کہ جیسے کسی چڑیل نے اسے پیچھے سے آواز دی ہے۔ جنگل میں ایک کنواں آ گیا۔ شہزاد ذرا ستانے کے لیے وہاں بیٹھا تو ایک آدمی تیز تیز قدموں سے جا رہا تھا۔ شہزاد کو دیکھ کر وہ رکا اور آواز دے کر بولا،

”اے نادان لڑکے کیوں اپنی جان کے دشمن بن گئے ہو۔ جانتے نہیں چڑیل طلالتی کے نکلنے کا وقت ہو رہا ہے۔ بھاگو یہاں سے۔“

وہ آدمی تیز تیز چلتا آگے نکل گیا۔ اب تو شہزاد کو بھی وہم سا ہونے لگا کہ سب لوگ





کہتے ہیں تو کہیں سچ مچ جنگل میں چڑیل نہ نکل آئے۔ مگر پھر فوراً ہی شنزاد نے اس خیل کو جھٹک کر ذہن سے نکل دیا مگر اب وہاں بیٹھے کو بھی اس کا جی نہ ملتا تھا۔ وہ بھی اس طرف چل پڑا جدھر وہ آدمی گیا تھا۔ جنگل کافی بڑا تھا۔ جوں جوں شام قریب آرہی تھی شنزاد کا چڑیل کے بارے میں وہم بھی بڑھ رہا تھا۔ اس کے شعور کے نیچے بیٹھا ہوا چڑیل کا خیل اب اپنے پر پرزے نکالنے لگا تھا اور شنزاد کے دماغ پر اثر ڈال رہا تھا۔ قدرتی طور پر شنزاد کے قدم تیز ہو گئے سورج کہیں مغرب میں غروب ہونے لگا تھا اور درختوں میں اندھیرے کی چادر پھیل رہی تھی۔

طلالہ چڑیل کا خیل اب شنزاد کے تحت الشعور سے نکل کر اس کے شعور میں آگیا اور اسے ڈرانا شروع کر دیا۔ شنزاد کو یونہی وہم سا ہونے لگا جیسے کسی درخت کے پیچھے سے اچانک تلالہ چڑیل نکل کر اس کے سامنے آ جائے گی۔ اس نے دوڑنا شروع کر دیا۔ مگر جنگل ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اچانک شنزاد کو جیسے زمین نے جکڑ لیا اس کے پاؤں من من بھاری ہو گئے۔ اس کا چہرہ دہشت کے مارے سفید ہو گیا۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر ایک درخت کے پیچھے سے نکل کر ایک ڈراؤنی شکل والی عورت جس کے بال کھلے تھے، چہرے پر وحشت برس رہی تھی اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ ڈراؤنی شکل والی عورت نے ایک مکروہ قہقہہ لگایا اور کہا،

”تو میرے قابض میں آگیا۔ میں تلالہ چڑیل ہوں۔ جا درخت بن جا۔ درخت بن جا۔ درخت بن جا۔“

عورت نے اپنی لائٹھی کا رخ شنزاد کی طرف کر کے بھیاں لگایا۔ شنزاد کا ذہن پہلے سے تیار ہو چکا تھا۔ جنگل میں جو بھی اسے ملا تھا اس نے یہی کہا تھا کہ شام کو تلالہ چڑیل نکلتی ہے اور جو اس کے سامنے آئے جو اسے دیکھے وہ درخت بن جاتا ہے۔ شنزاد کی چیخ نکل گئی اور وہ دھڑام سے گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

اسے کچھ ہوش نہ رہا کہ وہ کہاں ہے۔ جب اسے ہوش آیا تو وہی جنگل تھا اور دن کی روشنی پھیل رہی تھی۔ شنزاد بے اختیار اٹھا۔ اس نے اپنے بازو پر ہاتھ پھیرا تو اسے یوں لگا جیسے وہ کسی درخت کی ٹنٹی پر ہاتھ پھیر رہا ہے۔ اس نے جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اسے کانٹے چبھے تھے۔ اس نے دوسرے بازو پر ہاتھ پھیرا۔ دوسرا بازو بھی اسے درخت کی کانٹوں بھری ٹنٹی لگا۔ شنزاد نے گھبرا کر اپنے سینے پر ہاتھ لگایا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی درخت کے تنے کو چھو رہا ہے۔ اسے اپنے سر کے اوپر درخت کی چھوٹی چھوٹی کانٹے بھری ٹنٹیاں لگی ہوئی نظر آنے لگیں اس نے اپنے دماغ پر زور ڈالا۔ اسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ اگر کچھ یاد تھا تو یہی کہ وہ ایک درخت ہے۔ اتنے میں ایک لکڑہارا کلہاڑا لے کر وہاں سے گزرا تو شنزاد نے چیخ کر التجا کی۔

”اللہ کے لیے مجھے مت کلنا میں ابھی چھوٹا سا درخت ہوں۔ اللہ کے لیے مجھے نہ کلنا۔ مجھے نہ کلنا۔“

یہ کہہ کر شنزاد ایک طرف کو بھاگ اٹھا۔ لکڑہارا حیرانی سے دیکھتا رہ گیا کہ اس لڑکے کو کیا ہو گیا ہے۔

شنزاد دوڑتے دوڑتے اس مقام پر جا پہنچا جہاں جنگل ختم ہو جاتا تھا اور ریت کے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو رہا تھا۔ ان ٹیلوں میں کہیں کہیں کھجور کے درختوں کے جھنڈ بھی نظر آ رہے تھے۔ شنزاد نے دونوں بازو سینے پر باندھ رکھے تھے۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ سہما سہما سا کھجوروں کے جھنڈ کی طرف چلا جا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں صرف ایک ہی خیال تھا کہ وہ کانٹے دار شاخوں والا درخت ہے۔ اسے اور کچھ بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنا نام اور اپنے تاریخی سفر اور سانچی دوست کو بھی بھول چکا تھا۔ چلتے چلتے ایک چھوٹا سا نخلستان آگیا۔ نخلستان میں کھجور کے درختوں کے نیچے چشمہ بہ رہا تھا۔ دو عورتیں صراحیوں میں پانی بھر رہی تھیں۔ شنزاد اچانک بازو کھول کر ان کے سامنے

آہی باؤلی کاراز

کھڑا ہو گیا اور چلایا۔

”بہنو! میں درخت ہوں۔ مجھ پر پانی ڈالو۔ میری جڑیں سوکھ رہی ہیں۔“  
عورتیں ڈر کر بھاگ گئیں۔

# شیخ رازی سے ملاقات

شہزاد عورتوں کو آوازیں دیتا رہا۔

”مجھ سے ڈرو نہیں۔ درخت کسی کو کچھ نہیں کہتے۔ میری جڑیں سوکھ رہی ہیں۔ مجھے پانی دو۔ مجھے پانی دو۔“

مگر عورتیں ریت کے ٹیلے کے پیچھے غائب ہو چکی تھیں۔ شہزاد نے جیشے میں جھلانگ لگا دی۔ پانی اس کے گھٹنوں تک تھا اس نے اپنے جسم پر پانی ڈالنا شروع کر دیا، ساتھ ہی خوش ہو کر بول رہا تھا،

”سوکھے درخت کو پانی مل گیا اللہ تیرا شکر ہے۔ میری سُوکھی جڑوں کو پانی مل گیا۔ اب میری ٹہنیوں پر نئی کونپلیں پھوٹیں گی۔ نئے نئے ہرے بھرے پتے نکلیں گے۔“

بغداد شہر سے چند کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ ایک قافلہ بغداد کی طرف جاتے ہوئے وہاں سے گزرا تو کچھ لوگ پانی پینے جیشے پر آگئے۔ شہزاد انھیں دیکھ کر پیچھے ہٹ گیا اور بولا:

”اللہ کے لیے مجھے ہاتھ نہ لگانا میری ٹہنیوں پر نئی نئی کونپلیں پھوٹی ہیں وہ ٹوٹ جائیں گی۔“

مسافروں نے تعجب سے شہزاد کو دیکھا۔ ایک نے پوچھا، ”لڑکے! تم کون ہو؟“ شہزاد نے جواب دیا۔

”کمل ہے درخت سے پوچھ رہے ہو کہ وہ کون ہے؟ اس درخت ہوں اور کون ہوں دیکھتے نہیں یہ میری شہنشاہ ہیں یہ میری جڑیں ہیں۔“

اوتوں نے اسے پاگل سمجھ کر کچھ نہ کہا اور جیسے پر منہ ہاتھ دھونے لگے ان میں ملک ایران کا ایک نوجوان مسلمان لڑکا بھی تھا جو نامور مسلمان طبیب الرازی سے درس لینے بغداد جا رہا تھا اس کو معلوم تھا کہ طبیب الرازی دنیائے اسلام کا پہلا حکیم ہے جو جسمانی بیماریوں کے علاج کے ساتھ نفسیاتی بیماریوں کا بھی علاج کرتا ہے۔ شہزاد کو دیکھتے ہی وہ سمجھ گیا کہ وہ کسی نفسیاتی مرض میں مبتلا ہے ورنہ وہ درخت نہیں ہے بلکہ نوجوان لڑکا ہے۔ یہ ایرانی طالب علم جس کا نام اسفندیار تھا نفسیاتی بیماریوں کے سلسلے میں ہی حکیم الرازی سے مزید تعلیم حاصل کرنے بغداد آیا تھا اس نے سوچا کہ کیوں نہ اس لڑکے کو حکیم الرازی کے ہسپتال میں لے جا کر اس کا نفسیاتی علاج کرایا جائے اس طرح سے وہ استاد مکرم حکیم الرازی کو نفسیاتی علاج کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھے گا اور اس کے علم میں بہت اضافہ ہو گا چنانچہ اس نے کسی نہ کسی طرح شہزاد کو اپنے ساتھ بغداد چلنے پر راضی کر لیا۔ شہزاد بد باد ایرانی طالب علم کو یہی کہتا، میں درخت ہوں، میں چل کیوں رہا ہوں، مجھے زمین میں گڑ دو، مجھے زمین میں گاڑ دو۔ ایرانی طالب علم اسفندیار نے کہا، فکر نہ کرو دوست بغداد چل کر میں تمہیں ایک باغ میں لگا دوں گا۔“ شہزاد بڑا خوش ہوا۔ قافلہ بغداد کی طرف روانہ ہو گیا۔

لوہروہ ٹھگ بھی بغداد پہنچ گئے تھے جن میں سے ایک ٹھگ نے شہزاد کے گلے سے آویز اتار لیا تھا۔ بغداد پہنچنے کے بعد اس ٹھگ نے آویز ایک جوہری کے پاس فروخت



کر دیا اور پیسے لے کر چلتا ہوا۔ جوہری نے اس لیے تعویذ خرید لیا کہ وہ چاندنی کا تھالو دوسرے اس پر ہلال کا بڑا خوبصورت ڈیزائن بنا ہوا تھا اسی شام بغداد شہر کے ایک سوداگر کی بیٹی زرتاج کچھ زیور خریدنے جوہری کی دکان پر آئی تو اسے وہ تعویذ پسند آگیا۔ اس نے دوسرے زیورات کے ساتھ وہ تعویذ بھی خرید لیا اور گھر آکر اپنے گلے میں ڈال لیا تعویذ گلے میں ڈالتے ہی اسے کچھ بوجھ سا محسوس ہوا مگر اس نے کوئی خیال نہ کیا۔ زرتاج کو تعویذ پر بنا ہوا ہلال کا نشان بڑا اچھا لگا تھا چنانچہ اس نے تعویذ پہنے رکھا۔

قافلہ بغداد پہنچ کر کدواں سرائے میں اتر لہا ایرانی طالب علم اسفندیار نے شہزاد کو ساتھ لیا اور حکیم الرازی کے شفاخانے کی طرف چل پڑا شہزاد اس کے ساتھ چلنے پر راضی نہیں ہو رہا تھا مگر جب اسفندیار نے کہا میں تمہیں بغداد کے شہی باغ لے جا رہا ہوں وہاں تمہیں دوسرے درختوں کے ساتھ زمین میں لگا دوں گا تم درخت ہونا اس لیے درختوں میں خوش رہو گے؟

اس پر شہزاد اس کے ساتھ خوشی خوشی چل پڑا۔

شفاخانے میں جا کر اسفندیار کو پتا چلا کہ حکیم الرازی اپنے مدرسے میں درس دے رہے ہیں مدرسہ شہی ہسپتال کے ساتھ ہی تھا۔ شہزاد ضد کرنے لگا کہ مجھے یہیں زمین میں لگا دو میں کہیں اور نہیں جاؤں گا۔ اسفندیار نے سوچا کہ یہ لڑکا مدرسے میں استاد محترم کے درس میں خلل ڈالے گا چنانچہ اس نے شفاخانے کے نفسیاتی امراض کے ناظم کو الگ لے جا کر شہزاد کا سدا حل بتایا کہ یہ لڑکا نفسیاتی مرض میں مبتلا ہے اور اسے وہم ہو گیا ہے کہ میں درخت ہوں اسے کچھ دیر کے لیے یہیں ہسپتال میں رکھو استاد مکرم جب درس سے فارغ ہو کر شفاخانے آئیں گے تو اسے دکھائیں گا۔

ناظم نے شہزاد سے کہا، ”میں میرے ساتھ آؤ۔“ شہزاد چونک کر بولا، ”تم کون ہو؟ میں تو درخت ہوں۔“

ناظم نے کہا، ”میں اسی باغ کا مالی ہوں میں تنہیں زمین میں لگاؤں گا۔“  
 شہزاد نے کہا، ”تمدا اشکریہ بس جلدی سے مجھے زمین میں لگاؤ اور میری جڑوں  
 میں پانی ضرور دینا میری جڑیں خشک ہو رہی ہیں۔“  
 شہزاد کو شفاخانے کے شعبہ نفسیات کے ناظم کے حوالے کر کے اسفندیار مدرسے  
 کی طرف چلا۔

جس وقت وہ جماعت میں داخل ہوا حکیم زکریا رازی طالب علموں کو درس  
 دے رہے تھے۔ بدعب سرخ و سفید چہرہ، لمبی داڑھی، سر پر ایرانی طرز کا عمامہ چہرے پر  
 نور برس رہا تھا۔ اسفندیار خاموشی سے دوسرے طلبہ کے پاس بیٹھ گیا۔ حکیم رازی  
 فرما رہے تھے۔

”ایک مسلمان طبیب پر لازم ہے کہ وہ طبی اور اخلاقی اصولوں کی سختی سے پابندی  
 کرے اس مدرسے سے جب آپ لوگ تعلیم حاصل کر کے واپس جائیں گے تو آپ کو  
 عہد کرنا ہو گا کہ آپ کسی کو ایسی دوائی نہیں دیں گے جس سے وہ بیمار ہو جائے نہ کسی کو  
 زہر دیں گے اور نہ اپنے مریض کی بیماری کا حل کسی دوسرے کو بتائیں گے۔“

اللہ تعالیٰ نے انسان کو نیکی اور بدی میں فرق کرنے کی صلاحیت عطا کر دی ہے  
 اس لیے آپ کو بدی سے دور رہ کر نیکی کا راستہ اختیار کرنا چاہیے اپنے جذبات کو قابو رکھنا  
 ہو گا اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل کی نعمت عطا کی ہے جو اس کی بہت بڑی نعمت ہے اسی عقل  
 کی وجہ سے انسان دوسرے حیوانات سے افضل اور اعلیٰ ہے بغیر عقل کے انسان اور کسی  
 حیوان میں کوئی فرق نہیں۔ عقل ہی کے ذریعہ سے انسان اللہ کی بتائی ہوئی کائنات،  
 آسمان، سورج، چاند، ستاروں اور دوسری چیزوں پر غور کرتا ہے اور اسی کی بدولت اپنے  
 خالق تک پہنچتا ہے اور اپنی دنیا کی زندگی کو خوبصورت نیک اور پر امن بناتا ہے۔“

اسفندیار بڑے غور سے اسلامی دنیا کے اس نامور طبیب اور فلسفی کی تقریر سن رہا

تھا۔ سب طالب علم بڑے ادب سے بیٹھے اپنے استاد مکرم کے خیالات سن رہے تھے۔ اپنا لیکچر ختم کر کے حکیم رازی دوسرے کمرے کی طرف تشریف لے گئے۔ اسفندیار دوسرے کمرے میں ان کی اجازت سے حاضر ہوا اور بتایا کہ میں ایران کے شررے سے آیا ہوں اور آپ سے تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہوں کیوں کہ اس وقت ساری دنیا میں آپ سے بڑھ کر عالم فاضل دوسرا کوئی نہیں ہے۔ حکیم رازی کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ انھوں نے فرمایا:-

”ایسی بات نہیں ہے۔ اللہ کی دنیا کبھی بھی عالم فاضل لوگوں سے خالی نہیں رہی، اس وقت بھی دنیا میں مجھ سے بڑھ کر عالم لوگ ہوں گے، لیکن ہمیں ان کا علم نہیں ہے، بہر حال مجھے خوشی ہوئی کہ تم میرے وطن رے سے آئے ہو جہاں میں پیدا ہوا تھا۔ تم مدرسے میں دوسرے طلبہ کے ساتھ بیٹھ کر میرے درس میں شریک ہو سکتے ہو۔“

اسفندیار نے حکیم رازی کا بڑے ادب سے شکریہ ادا کیا اور عرض کی:

”استاد مکرم! آپ کی توجہ کے لیے میں ایک لڑکے کو بھی ساتھ لایا ہوں اس کو کسی طرح یہ وہم ہو گیا ہے کہ وہ ایک درخت ہے۔ وہ ہر ایک سے یہی کہتا ہے کہ مجھے زمین میں گاڑ دو میں درخت ہوں میری جڑوں کو پانی دو مجھے ہاتھ نہ لگانا میری ٹہنیوں پر کانٹے لگے ہوئے ہیں۔“

حکیم ابو بکر محمد بن زکریا رازی مسکرائے اور فرمایا:

”وہ ضرور دشتِ مغلایاں سے گزرا ہو گا۔“

اسفندیار نے عرض کی کہ یہ دشتِ مغلایاں کیا چیز ہے؟ اس پر استاد محترم حکیم

رازی نے فرمایا:

”بغداد سے کچھ فرلانگ کے فاصلے پر یہ کانٹے دار سیاح درختوں کا ایک جنگل

ہے۔ اس جنگل میں ایک چرواہا اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا وہ جنگل میں لکڑیاں کاٹ کر شر

جا کر فروخت کر دیتا۔ ایک روز ایسا ہوا کہ چرواہا شام کے وقت لکڑیاں بیچ کر واپس جنگل سے گزر رہا تھا کہ ایک چیتا اسے اٹھا کر لے گیا: جب وہ رات کو جھوپڑی میں نہ پہنچا تو اس کی بیوی پریشان ہو کر اپنے خاوند کو تلاش کرنے لگی، مگر چرواہے کی لاش بھی نہ ملی۔ غم زدہ بیوی اس صدمے سے نیم دیوانی ہو گئی۔ لوگ اسے تنگ کرتے تھے، کسی نے ایک دن اس سے کہہ دیا کہ تمہارے خاوند کو کسی جادوگر نے درخت بنادیا ہے بس یہ بات اس دیوانی عورت کے ذہن میں اٹک گئی اب وہ شام کے وقت جب ہلکا ہلکا اندھیرا جنگل میں پھیل جاتا تو درختوں میں نکل آتی ہے اور جو کوئی مسافر اسے ملتا ہے اس کو بلند آواز سے کہتی ہے جادو درخت بن جاؤ نے میرے خاوند کو درخت بنادیا ہے تو بھی درخت بن جا۔ شروع شروع میں تو لوگوں نے کوئی خیال نہ کیا مگر کچھ عرصے بعد لوگوں میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ چرواہے کی بیوی چڑیل بن گئی ہے اور وہ جنگل سے شام کے وقت گزرنے والے کو درخت بنادیتی ہے جیسا کہ لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ کوئی اس قسم کی بات سنتے ہیں تو آگے بڑھا چڑھا کر سناتے ہیں چنانچہ کچھ لوگوں نے تو یہاں تک مشہور کر دیا کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے ایک مسافر کو درخت بنتے دیکھا ہے اس کے بعد یہ آسیبی جنگل مشہور ہو گیا دن کے وقت تو لوگ یہاں لکڑیاں وغیرہ کاٹنے آ جاتے سورج غروب ہونے کے بعد کوئی اس جنگل کا رخ نہیں کرتا تھا مجھے یقین ہے کہ تمہارے اس دوست لڑکے کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ وہ اس جنگل سے شام کے وقت گزرا ہو گا۔ چرواہے کی دیوانی بیوی نے اچانک سامنے آ کر اسے کہا ہو گا کہ جادو درخت بن جا اور نفسیاتی طور پر تمہارے اس دوست کے دماغ میں یہ دہم جڑ پکڑ گیا کہ وہ درخت بن گیا ہے۔۔۔

اسفند یار بڑے غور سے حکیم رازی کی باتیں سن رہا تھا جب انہوں نے سلسلہ کلام بند کیا تو اسفندیار نے عرض کی،

”جناب علی! جیسا آپ نے فرمایا ضرور ایسا ہی ہوا ہو گا آپ ایک نظر لڑکے کو





دیکھ لیجیے میں اسے شفاخانے میں چھوڑ آیا تھا۔ ”حکیم رازی نے فرمایا، ”میں شفاخانے ہی کی طرف جڑا ہوں آؤ میرے ساتھ۔“ بغداد کا شہی شفاخانہ مدرسے کے برابر ہی تھا جب حکیم رازی شفاخانے کے بڑے کمرے میں تشریف لائے تو شہزاد اس وقت مریضوں والے پٹنگ پر دونوں بازو پھیلائے کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا۔

”خبردار میرے قریب نہ آنا میری ٹہنیوں پر دو تو تے بیٹھے ہیں وہ اڑ جائیں گے میری ٹہنیوں کو ہاتھ نہ لگاتا۔“

حکیم رازی کو تشریف لاتا دیکھ کر شفاخانے کے ملازم ادب سے کھڑے ہو گئے۔ اسفندیار نے عرض کی۔

”استاد محترم! یہی وہ لڑکا ہے جسے یقین ہو گیا ہے کہ میں درخت ہوں۔“ شہزاد کو کچھ ہوش نہیں تھا اس نے حکیم رازی کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو فوراً پکارا۔

انٹان

”میرے قریب نہ آئے میری ٹہنیوں پر بیٹھے ہوئے تو تے اڑ جائیں گے۔“

حکیم رازی نے شفاخانے کے خاص ملازموں کو اشارہ کیا۔ انھوں نے لپک کر شہزاد کو اپنے قابو میں کر کے پٹنگ پر لٹا دیا۔ شہزاد چلاتا رہا۔

”میرے تو تے اڑ گئے۔ میرے تو تے اڑ گئے پکڑو پکڑو میرے درخت کی ٹہنیاں نہ توڑو، مجھے زمین میں گاڑ دو، میں درخت ہوں۔“

اتنی دیر میں حکیم رازی کے دوسرے اشارے پر شفاخانے کے ایک ملازم نے شہزاد کا منہ کھول کر ایک خاص دوائی کے چند قطرے حلق میں ٹپکا دیے، اس دوائی کے اثر سے شہزاد پر غیند کا غلبہ ہو گیا اور وہ گہری نیند سو گیا۔ تمام طلبہ پٹنگ کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ وہ یہ دیکھنے کو بے تاب تھے کہ اسلامی دنیا کا یہ سب سے بڑا طبیب اور حکیم اس لڑکے کا

کس طرح علاج کرتا ہے۔ شہزادہ سورہا تھا اسفندیار جی حکیم سائب کے پہلو میں کھڑا تھا۔ ایک طالب علم نے سوال کیا:

”شیخ محترم! اسے یہ مرض کیسے لاحق ہو گیا؟“

حکیم رازی نے فرمایا:

”عزیز طلبہ! یہ کوئی مرض نہیں جو اس لڑکے کو لاحق ہوا ہے بلکہ ایک خیل ہے جو اس کے تحت الشعور میں بٹھا دیا گیا تھا کہ تم درخت ہو یہ خیل دشتِ مغیلاں کی چڑیل نے اس کے دماغ میں ڈالا ہے، ضرور اس سے پہلے کچھ لوگ جنگل سے گزرے ہوں گے جنہوں نے اس لڑکے کو کہا ہو گا کہ شام ہونے سے پہلے یہاں سے نکل جاؤ نہیں تو طلالہ چڑیل تمہیں درخت بنا دے گی یہ طلالہ بے چاری اس بد نصیب چرواہے کی بیوی ہے جس کو خلوند کی جدائی کے صدمے نے دیوانہ بنا دیا اور لوگوں نے اسے چڑیل کہنا شروع کر دیا بس لڑکے کے ذہن میں یہ خیل بیٹھ گیا اور جب اچانک طلالہ اس کے سامنے آئی اور اس نے کہا کہ جادو درخت بن جا تو نفسیاتی طور پر اس لڑکے کو یقین ہو گیا کہ میں درخت بن گیا ہوں۔“

اسفندیار نے پوچھا:

”استاد محترم! کیا ایسا ہر شخص کے ساتھ ہو سکتا ہے؟“

حکیم رازی نے فرمایا:

”نہیں ایسا صرف ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جن کے اندر ایمان اور ارادے کی طاقت کمزور ہوتی ہے جن لوگوں کا اللہ اور اس کے رسولؐ پر پختہ ایمان ہوتا ہے وہ ہمیں سے پاک ہوتے ہیں اور ان پر کوئی جادو بھی اثر نہیں کر سکتا جادو بھی کمزور ایمان والے لوگوں پر اثر کرتا ہے۔“

ایک اور طالب علم نے پوچھا۔

”شیخ مکرم! اس نفسیاتی مرض کا علاج کس طرح ہو گا؟“

حکیم رازی نے فرمایا:

”اس کا ایک ہی علاج ہے کہ اسے نفسیاتی طور پر یقین دلایا جائے کہ یہ درخت نہیں ہے انسان ہے اس کے لیے مریض کے ذہن سے ایک خیال کو نکال کر اس کی جگہ دوسرا خیال بٹھانا ہو گا۔ یہ لڑکا اس وقت نیند کی حالت میں ہے، لیکن میں اس کی طرف متوجہ ہو کر جو کچھ کہوں گا وہ اسے سنے گا اس وقت اس کا شعور سو رہا ہے، مگر شعور کا نچلا حصہ یعنی تحت الشعور بیدار ہے اسی حصے میں چڑیل نے یہ خیال بٹھا دیا ہے کہ یہ درخت ہے مجھے اس درخت کے اس خیال کو جڑ سے اکھاڑنا ہے۔“

پھر حکیم رازی نے ایک گلدان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا،

”اس گلدان میں سے درخت کی ٹہنی نکال کر مجھے دو۔“

اسفندیار نے اسی وقت گلدان میں سے درخت کی ٹہنی نکال کر شیخ محترم کی خدمت میں پیش کر دی۔ ٹہنی کے ساتھ سبز پتے لگے ہوئے تھے۔ حکیم رازی نے شہزاد کے سرہانے کی جانب کھڑے ہو کر کہا،

”تمہارا نام کیا ہے بیٹے؟“

شہزاد سو رہا تھا مگر اس کے ہونٹ اپنے آپ کھلے اور نیند بھری آواز میں بولا،

”میرا نام شہزاد ہے میں خواب کی دنیا میں عظیم مسلمان حکیم شیخ ابو بکر رازی سے ملنے کے لیے یہاں آیا تھا، مگر درخت بن گیا اب میں درخت ہوں۔“

شیخ رازی نے فرمایا:

”تم انسان ہو درخت نہیں ہو تمہارے اندر ایک خیال ہے جو درخت بن گیا ہے میں اس خیالی درخت کو تمہارے سامنے جڑ سے اکھاڑ کر پھینک رہا ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی حکیم رازی گلدان والی ٹہنی شہزاد کے کان قریب لے گئے اور

اسے توڑنے لگے۔ ٹہنیوں کے ٹوٹنے کی آواز آرہی تھی۔ حکیم رازی نے شنراذ سے کہا:

”وہ درخت ٹوٹ چکا ہے بیٹے جس نے تم پر لپٹا سلیہ ڈالا ہوا تھا۔ کیا تم نے اپنے درخت کے ٹوٹنے کی آواز نہیں سنی۔“

”ہاں میں نے درخت کے ٹوٹنے کی آواز سنی ہے۔“

شنراذ کے ہونٹ اپنے آپ یہ جملہ بول رہے تھے۔

حکیم رازی نے کہا، ”بیٹے آنکھیں کھول دو اب تم پھر سے انسان بن گئے ہو اللہ کا نام لے کر آنکھیں کھول دو۔“

شنراذ نے آنکھیں کھول دیں اور حیرانی سے ایک پُر نور بزرگ چہرے کو آنکھوں کے سامنے دیکھا وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا:

”میں کہاں ہوں؟“

ایرانی طالب علم اسفندیار نے کہا:

”شنراذ تم اس وقت بغداد کے شہی شفاخانے میں عالم اسلام کے سب سے عظیم حکیم و طبیب شیخ ابو بکر رازی کے سامنے ہو۔“

شنراذ کو اپنے درخت بن جانے کا کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا وہ پوری طرح صحت یاب ہو چکا تھا اس نے جلدی سے حکیم رازی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چوما اور بولا،

”شیخ مکرم! میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ مجھے آپ جیسی عظیم الشان ہستی کو دیکھنا نصیب ہوا۔“

اسفندیار نے کہا، ”شیخ محترم کے نفسیاتی علاج ہی سے تم صحت مند ہوئے ہو

شنراذ تمہیں وہم ہو گیا تھا کہ تم درخت ہو۔“

شنراذ کو اب یاد آگیا۔ وہ بولا:

”ہاں ہاں میں ایک جنگل سے گزر رہا تھا جہاں کئی لوگوں نے مجھ سے کہا تھا کہ اس جنگل میں کوئی چڑیل آتی ہے جو انسانوں کو درخت بنا دیتی ہے پھر ایک چڑیل مجھے بلی تھی۔“

شیخ رازی نے بڑی شفقت سے شنزاد کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔  
 ”میرے عزیز! جب انسان اللہ کی یاد سے غافل ہو جاتا ہے تو اس پر شیطان حملہ کرتا ہے اور پھر کوئی منفی خیال شعور سے اتر کر لاشعور کی تہ میں بیٹھ جاتا ہے اس لیے اسلام ہمیں یہ ہدایت کرتا ہے کہ اپنے ذہن کو اللہ کی یاد سے کبھی غافل مت رکھو ہر گھڑی ہر حالت میں اللہ اور اس کے رسول کی یاد اپنے دل میں رکھو اس طرح سے انسان ہر برائی اور شیطان کی ناپاک سازش سے بچا رہتا ہے تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو تمہارے لباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم ملک روم کے رہنے والے ہو، مگر تم عربی بڑی روائی سے بولتے ہو۔“

شنزاد کو یاد آگیا کہ سانچی نے اس سے وعدہ لیا تھا کہ ہرگز ہرگز اس تاریخی سفر میں کسی کو یہ نہ بتاؤ کہ تم آگے کے جدید زمانے سے نکل کر تاریخ کے پرانے زمانے میں آئے ہو، چنانچہ شنزاد بولا۔

”یا شیخ! میں ملک روم ہی کارہنے والا ہوں، مگر میرا باپ بغداد کارہنے والا تھا وہ مسلمان تھا اس لیے میں عربی روائی سے بول لیتا ہوں مجھے آپ سے ملاقات کا شوق ملک روم سے یہاں کھینچ لایا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ آپ کو دیکھنا نصیب ہوا میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری ہو گئی۔“

شیخ ابو بکر رازی نے پوچھا:  
 ”یہاں تمہارا قیام کہاں ہے؟“



”یا شیخ! میں تو قافلے کے ساتھ اس شہر کی طرف آ رہا تھا کہ جنگل میں چلا گیا اور پھر درخت بن گیا۔“ شیخ رازی اور دوسرے طالب علم تھوڑا تھوڑا مسکراتے۔ اسفندیار نے کہا، ”مگر اب تو تم درخت نہیں ہو۔“

”میں کبھی بھی درخت نہیں تھا۔“ شہزاد نے جواب دیا، ”وہ تو ایک خیل کا اثر ہو گیا تھا اگر شیخ محترم میرا علاج نہ کرتے تو نہ جانے میں کب تک درخت ہی بنا رہتا۔“

شیخ رازی نے اسفندیار کی طرف دیکھ کر کہا، ”یہ طالب علم تمہیں میرے پاس لایا تھا تمہیں خداوند کریم کا شکر اور اس طالب علم کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔“

اسفندیار نے مسکراتے ہوئے کہا،

”میرا نام اسفندیار ہے۔“

شہزاد نے اسفندیار کا شکریہ ادا کیا اور کہا،

”یا شیخ! میں جب تک بغداد میں ہوں آپ کے پاس ہی رہنا چاہتا ہوں تاکہ

روزانہ آپ کا درس سنوں۔“

شیخ ابو بکر رازی اٹھ کھڑے ہوئے انہوں نے ایک طالب علم سے کہا، ”شہزاد کو مدرسے کے ایک حجرے میں ٹھیرادو۔ اس کے کھانے پینے کا انتظام بھی مدرسے کی طرف سے ہی ہو گا۔“ یہ فرما کر شیخ رازی شفاخانے کے دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

## سانپ پیچھے لگا تھا

حجرے میں آکر شہزاد نے اپنے محسن اور نئے دوست ایرانی طالب علم اسفندیار سے کہا،  
”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں اسلامی عہد کے طبیب اعظم ابو بکر محمد بن ذکریا رازی سے ملاقات کر کے آ رہا ہوں۔“

اسفندیار بولا، ”اس میں یقین نہ کرنے کی کون سی بات ہے؟ بھئی یہ سن ۸۶۴ء ہے تم روم سے اور میں ایران سے یہاں بغداد میں آیا ہوں۔ طبیب اعظم رازی بغداد کے شاہی شفاخانے کے ناظم اعلا ہیں اور مدرستہ الحکمت میں درس بھی دیتے ہیں۔“

شہزاد اسے کیسے بتاتا کہ وہ روم سے نہیں بلکہ آگے کے زمانے سے آیا ہے جہاں دفتروں میں ایئر کنڈیشنرز لگے ہیں اور کمپیوٹروں سے کام لیا جاتا ہے اور انسان چاند پر پہنچ چکا ہے۔ وہ یہ راز کسی پر ظاہر نہیں کر سکتا تھا اس نے مزہ لینے کے لیے صرف اتنا کہا کہ،  
”اسفندیار کیا تم یقین کرو گے کہ ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا جب ملک امریکا کا ایک راکٹ آدمی کو لے کر چاند پر اترے گا اور لوگ ٹیلے ویزن پر انسان کو چاند پر چھلانگیں لگاتے دیکھیں گے۔“

اسفندیار نے عجیب نظروں سے شہزاد کی طرف دیکھا اسے محسوس ہوا کہ شہزاد پر

پھر کوئی دورہ پڑنے والا ہے اس نے کہا۔  
 ”یہ تم کس ملک امریکا اور ٹیلے ویرن اور راکٹ کا ذکر کر رہے ہو، یہ کن چیزوں کے نام ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم پر پھر کوئی دورہ پڑنے والا ہے۔“  
 شنزاد ہنس پڑا۔ بولا:

”میں تم سے مذاق کر رہا تھا اچھا مجھے طبیب اعظم استاد محترم رازی کے بارے میں کچھ اور بتاؤ۔“

اسفندیار حجرے کے قالین پر ٹکیے کے سہارے بیٹھا تھا۔ کہنے لگا:  
 ”شیخ کی شہرت تو روم شام تک پہنچی ہوئی ہے حیران ہوں کہ تم روم سے آئے ہو اور حکیم رازی کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔ اصل میں تم ابھی لڑکے ہو سنو، میں تمہیں ان کے بارے میں کچھ خاص خاص باتیں بتاتا ہوں۔ شیخ رازی کو دنیا میں پہلے مسلمان ماہر نفسیات کا درجہ حاصل ہے وہ شعور اور تحت الشعور کی گہرائیوں میں اتر کر مریض کا علاج کرتے ہیں جیسا کہ انہوں نے تمہارا علاج کیا۔ اسلامی طب میں تحلیل نفسی کا فن ذکر یا بن رازی کا ہی مرہون منت ہے۔ وہ ایران کے شررے میں پیدا ہوئے جہاں کا میں رہنے والا ہوں۔ ذکر یا رازی کو جراحی میں بھی کمال حاصل ہے زخم کو سینے کے نیچے تانت کا استعمال بھی انہوں نے ہی شروع کیا وہ عظیم طبیب ہونے کے علاوہ کیمیادان بھی ہیں وہ اس وقت تک مختلف موضوعات پر دیرھ سو سے زائد کتابیں لکھ چکے ہیں۔“  
 شنزاد کے منہ سے نکل گیا۔

”اور ان میں سے اکثر کتابوں کا انگریزی، فرانسیسی میں ترجمہ ہو چکا ہے اور پیرس، لندن اور ویانا کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔“

اسفندیار نے ایک بار پھر چونک کر شنزاد کی طرف دیکھا اور بولا،  
 ”شنزاد تم پر ابھی مرض کا اثر باقی ہے میرا خیال ہے تمہیں طبیب اعظم سے ایک بار پھر

معائنہ کروانا ہو گا۔ یہ تم اپنا تک عجیب عجیب الفاظ منہ سے نکالنے لگے ہو۔“

شہزاد کو بڑی ہنسی آئی مگر اوپر سے سنجیدہ بنا رہا اور بولا:

”دوست مجھے معاف کر دینا۔ کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے مجھے خود معلوم نہیں ہوتا کہ میں کیا بول رہا ہوں۔ اچھا حکیم محترم رازی کے بارے میں مزید کچھ بتاؤ۔“

اسفندیار نے کچھ سکون کا سانس لیتے ہوئے کہا:

”ابو بکر ذکریا رازی پہلے ہمدان شہر کے شاہی شفاخانے میں تھے مگر پھر ان کی شہرت سے متاثر ہو کر خلیفہ مکتفی نے انھیں بغداد بلا لیا اور یہاں کے عظیم الشان شفاخانے کا ناظم بنا دیا چنانچہ تم نے خود دیکھ لیا ہے کہ حکیم رازی یہاں کی درس گاہ میں طب کی تعلیم بھی دیتے ہیں، انھوں نے چیچک کا علاج (ٹیکا) ایجاد کیا اور پھر انھوں نے سب سے پہلے چیچک اور خسرہ پر ایک کتاب لکھی۔ انھوں نے اپنی ایک کتاب میں سب سے پہلے موتیا بند کے لیے آنکھ کی جراحی کا ذکر کیا ہے۔“

شہزاد کے منہ سے بے اختیار نکل گیا:

”آج انگلینڈ اور جرمنی کے ہسپتالوں میں سرجن موتیا بند کا آپریشن اسی طریقے سے کرتے ہیں جیسا کہ حکیم رازی نے دکھایا تھا۔“

اسفندیار نے سٹ پٹاتے ہوئے کہا:

”یہ تم کن جن بھوتوں والے لفظ استعمال کرنے لگے۔ یہ آپریشن، سرجن، ہسپتال یہ سب لفظ تم کہاں سے لے آئے ہو۔“

شہزاد نے جلدی سے کہا:

”معاف کر دینا دوست اب میں ایسا کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالوں گا، آئی ایم سوری۔“

”ہیں!“ اسفندیار چونکا، ”یہ کیا کہا تم نے؟“

شنزاد اٹھ کھڑا ہوا اور یہ کہہ کر حجرے سے باہر نکل گیا کہ میں ذرا بغداد شہر کی سیر کر لوں اس طرح میری طبیعت بہل جائے گی۔ اس کے جانے کے بعد اسفندیار نے سوچا کہ شنزاد کی حالت پھر بگڑتی جا رہی ہے اس پر اچانک دورے پڑتے ہیں حکیم طبیب اعظم کو دکھانا ہی ہو گا۔

دوسری طرف شنزاد بغداد کے بنے ہوئے پرانی طرز کے نیم روشن گلی کوچوں کی سیر کر رہا تھا یہ لوگ پرانے زمانے کا لباس پہنے ہوئے تھے۔ عورتوں کے چہرے نقاب میں چھپے ہوئے تھے۔ دکانیں سلان سے بھری ہوئی تھیں۔ ایک جگہ شنزاد کو بڑی علی شان حویلی نظر آئی حویلی کے باہر دو حبشی غلام سپرہ دے رہے تھے۔ شنزاد نے ایک دکاندار سے پوچھا، ”بھائی یہ کس کی حویلی ہے؟“ دکاندار نے کہا، ”تم بغداد شہر میں اجنبی لگتے ہو، یہ حویلی علی بابا کی ہے۔“

شنزاد نے منہ سے اپنے آپ نکل گیا۔

”وہ الف لیلا کے چالیس چوروں والا علی بابا؟“

دکاندار کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ حیرانی سے شنزاد کا منہ تکتے لگا، ”یہ کیا بک

رہے ہو؟“

تب شنزاد کو اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ الف لیلا تو شاید ابھی لکھی بھی نہیں گئی ہوگی۔ اس نے فوراً کہا،

”معاف کرنا بھائی میں یونہی اوٹ پٹانگ بک گیا تھا۔ یہ بتاؤ کہ علی بابا کہ پاس اتنی دولت کہاں سے آگئی؟ میں نے تو سنا ہے کہ وہ ایک غریب لکڑہارا تھا۔“

دکاندار بولا، ”کل تک تو وہ ایک غریب لکڑہارا ہی تھا مگر نہ جانے کہاں سے کوئی خزانہ اس کے ہاتھ لگ گیا اس نے حویلی بھی خرید لی اور اب ٹھٹ باٹھ سے زندگی بسر کرتا ہے۔“



شہزاد کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ علی بابا کو دیکھے جس کی کہانی اس نے بچپن میں پڑھی تھی۔ وہ علی بابا کی حویلی میں گیا۔ حبشی غلام نے اسے اندر جانے سے روک دیا۔ شہزاد حویلی کی پچھلی دیوار پھلانگ کر اندر چلا گیا۔ چار دیواری کے درمیان فوارہ لگا تھا۔ شام ہو چکی تھی برآمدے میں لیک جگہ کمرے میں شمع روشن تھی۔ شہزاد نے کھڑکی کے ساتھ کان لگا دیئے اندر کوئی عورت غم زدہ آواز میں کہہ رہی تھی۔

”علی بابا! قاسم اگر میرا خوند ہے تو تمہارا چچا زاد بھائی بھی ہے وہ صبح صبح تمہارے بتائے ہوئے خزانے کی تلاش میں گیا تھا مگر ابھی تک نہیں آیا۔ اللہ کے لیے اس کا پتا کرو میں تو غم سے نڈھال ہوں۔“

علی بابا نے کہا، ”بھابی تم گھبراؤ نہیں میں ابھی جا کر پتا کرتا ہوں میں نے تو اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ کھل جاسم سم کہنے سے غدا کا۔“ کھل جائے گا اور بند ہو جاسم سم کہنے سے غدا کا۔ اپنے آپ بند ہو جاتا ہے پھر اس نے اتنی دیر کیوں لگادی؟“

علی بابا چالیس چور کی ساری کہانی شہزاد کے ذہن میں گھوم گئی علی بابا جب ڈاکوؤں کے غار سے ہیرے، جواہرات اور اشرفیوں کے تھیلے سمیٹ کر اپنے گھر آیا تھا تو اپنے چچا زاد بھائی قاسم کے گھر سے اس نے مرجینا لونڈی کو بھیج کر ترازو منگوایا تھا تاکہ اشرفیوں کو تول سکے قاسم کی بیوی نے ترازو کے ایک پلڑے کے نیچے موم لگا دیا تھا تاکہ یہ پتا چل سکے کہ علی بابا کیا چیز تو لٹا چاہتا ہے جب ترازو واپس آیا تو اس کے پلڑے کے نیچے ایک اشرفی موم کے ساتھ چپکی ہوئی تھی تب قاسم وہ اشرفی لے کر علی بابا کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

”علی بھائی! میں چاہتا ہوں کہ تمہارے ہاتھ بہت دولت لگی ہے کیا تم اس میں سے اپنے بھائی کو حصہ نہیں دو گے؟“

علی بابا نے قاسم کو کھل کر ساری بات بتادی اور کہا کہ وہ بھی ڈاکوؤں کے غار میں

جائے اور جتنا چاہے خزانہ اٹھا کر لے آئے۔ اس نے قاسم کو وہ اسم بھی بتا دیا جس سے غار کھل جاتا ہے اور پھر بند ہو جاتا ہے۔ قاسم سخت لالچی تھا وہ گدھے لے کر ڈاکوؤں کے غار کے سامنے پہنچ گیا اور کھل جاسم سم کا اسم پکارا غار کا دروازہ کھل گیا۔ قاسم نے غار کے اندر جاتے ہی بند ہو جا کا اسم بول کر غار کا منہ بند کر دیا اور دونوں ہاتھوں سے ہیرے جواہرات اور اشرفیوں سے بھرے ہوئے تھیلے گدھے پر لا دے لگا جب وہ کافی خزانہ لا چکا تو واپسی کا ارادہ کیا مگر غار کے بند دروازے کے پاس آ کر وہ کھل جاسم سم کا اسم بھول گیا اسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا کہ غار کا دروازہ کھولنے والا اسم کیا تھا۔ وہ گھبرا گیا نہ جانے کیا کیا بولتا رہا مگر کھل جاسم سم اس کی زبان پر نہ آ سکا تنے میں ڈاکو آگئے ان کے سردار نے باہر کھڑے ہو کر کھل جاسم سم کا اسم پکارا۔ غار کا منہ کھل گیا ڈاکو اندر آگئے۔ قاسم اشرفیوں کے بورے کے پیچھے چھپ گیا ڈاکوؤں کو پہلے ہی شک تھا کہ کوئی چور ان کے پیچھے غار میں آتا ہے اور مل دولت سمیٹ کر لے جاتا ہے اب جو اس نے گدھوں پر اشرفیوں اور جواہرات کے تھیلے لدے دیکھے تو تلواریں کھینچ لی اور چیخ کر کہا۔

”چور ابھی غار میں ہی ہے وہ جانے نہ پائے۔“

ڈاکوؤں نے فوراً قاسم کو تلاش کر لیا۔ سردار نے تلواریں کے ایک ہی وار سے قاسم کی گردن اڑا دی اور اس کی لاش کو غار کی چھت سے لٹکا دیا جب سردار دن گزر گیا اور قاسم گھر نہ پہنچا تو اس کی بیوی دوڑی دوڑی علی بابا کے پاس آئی۔ اب آگے شہزاد خود علی بابا چالیس چور کی کہانی میں داخل ہو گیا تھا وہ اس کہانی کو اپنی آنکھوں کے سامنے ڈرامے کی شکل میں سنیجہ ہوتے دیکھ رہا تھا علی بابا نے قاسم کی بیوی کو تسلی دے کر واپس بھیج دیا اور خود گدھے پر سوار ہو کر رات کی تاریکی میں بغداد شہر کے باہر ڈاکوؤں کے غار کی طرف چل پڑا۔

شہزاد نے بھی حویلی سے نکل کر علی بابا کا تعاقب شروع کر دیا وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا

کہ کیا علی بابا چالیس چور کی کہانی واقعی سچی ہے۔ علی بابا غدر کے سامنے گدھے سے اتر پڑا۔ تاروں کی ہلکی ہلکی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ علی بابا نے ادھر ادھر نظر ڈالی کہ وہاں کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا۔ شہزاد اچانک اس کے سامنے آگیا، علی بابا نے یہ ظاہر کیا کہ وہ جنگل میں راستہ بھول گیا ہے۔ شہزاد سے پوچھنے لگا۔ ”بیٹا شہر بغداد کو یہاں سے کون سا راستہ جاتا ہے۔؟“ شہزاد نے مسکرا کر کہا۔

”آپ بغداد شہر ہی سے تو آرہے ہیں۔“

اس جواب پر علی بابا کچھ گھبرایا۔ کہنے لگا، ”نہیں بیٹا میں تو بغداد جا رہا ہوں راستہ بھول گیا تھا۔“ شہزاد نے قریب آکر کہا۔

”محترم! میں جانتا ہوں آپ علی بابا ہیں اور آپ ڈاکوؤں کے غدر میں اپنے چچا زاد بھائی کو تلاش کرنے آئے ہیں اس کا نام قاسم ہے۔“

اب تو علی بابا بہت ہی حیران ہوا کہ اس لڑکے کو یہ سب کچھ کیسے معلوم ہو گیا۔ علی بابا نے پوچھا، ”لڑکے تم کون ہو؟ کیا تم کوئی جادوگر ہو؟“ شہزاد نے ہنس کر کہا،

”میں جادوگر نہیں ہوں، لیکن سب جانتا ہوں مجھے وہ اسم کے لفظ بھی معلوم ہیں کہ جس کو بولنے سے سامنے والے غدر کا منہ کھل جاتا ہے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ غدر کے اندر تمہارے چچا زاد بھائی کی لاش لٹک رہی ہے۔“

علی بابا ہکا بکا ہو کر شہزاد کا منہ تکتے لگا۔ شہزاد نے کہا،

”میں ابھی وہ الفاظ کہہ کر غدر کا منہ کھولتا ہوں۔“

اتنا کہہ کر شہزاد نے بلند آواز میں کہا۔

”کھل جاسم سم“

ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ غدر کا منہ کھل گیا جو نہی علی بابا غدر میں داخل ہوا یہ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے کہ چھت کے ساتھ قاسم کی لاش لٹک رہی تھی اور

اس کا کٹا ہوا سر نیچے پڑا ہوا تھا۔ ڈاکو وہاں نہیں تھے۔ علی بابا کو یقین ہو گیا کہ شہزاد کسی جادوگر کا بیٹا ہے۔ شہزاد نے علی بابا سے کہا، ”محترم! جلدی سے لاش اتار دو اور لے کر یہاں سے بھاگ چلو ڈاکو کسی بھی وقت آجائیں گے۔“

علی بابا نے قاسم کی لاش سمیٹ کر بوری میں بند کی اور گدھے پر لاد کر غار سے باہر نکل آیا۔ شہزاد نے دیکھ لیا تھا کہ قاسم کی لاش کے ایک پاؤں کی جوتی وہیں رہ گئی ہے اس نے جان بوجھ کر اسے نہ اٹھایا اور وہیں رہنے دیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ علی بابا چالیس چور کی کہانی کے مطابق اسی جوتی کو لے کر ایک ڈاکو علی بابا کی حویلی کا سراغ لگائے گا۔ پھر ڈاکو چالیس کپڑوں میں چھپ کر علی بابا کی حویلی میں داخل ہوں گے ان کا سردار اپنے آپ کو تیل کا سوداگر ظاہر کرے گا۔ علی بابا کی لونڈی مرجینا ان کپڑوں میں رات کو کھولتا ہوا تیل ڈال کر تمام ڈاکوؤں کو ہلاک کر دے گی۔ شہزاد قاسم کی لاش کی جوتی اٹھا کر علی بابا چالیس چور کی کہانی کی کڑیوں کو درہم برہم نہیں کرنا چاہتا تھا۔

علی بابا شہزاد کو بھی اپنی حویلی میں ساتھ ہی لے آیا یہاں قاسم کی لاش کو راتوں رات قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ علی بابا نے دوسرے دن شہزاد کو بڑے مزے کے کھانے کھلائے نئی پوشاک پہننے کو دی اور کہا، ”بیٹے شہزاد! تم جادو جانتے ہو مجھے بتاؤ کہ کہیں ڈاکوؤں کے سردار کو پتا تو نہیں چل جائے گا کہ ان کا خزانہ میں نے لوٹا ہے؟“ شہزاد سوچنے لگا۔ پھر بولا:

”محترم علی بابا! یہ بات میں آپ کو نہیں بتا سکتا بلکہ یوں سمجھ لیجیے کہ مجھے یہ راز کھولنے کی اجازت نہیں ہے، لیکن اتنا ضرور بتا دینا چاہوں گا کہ آپ کو کچھ نہیں ہو گا۔“

شہزاد نے علی بابا سے اجازت لی اور اسفندیار کے پاس حجرے میں آگیا۔ وہ پریشانی سے بولا، ”تم رات کہاں تھے؟“ شہزاد نے کہا، ”میں شر کے ایک سوداگر علی بابا کی حویلی میں تھا“ اور پھر نئی پوشاک دکھا کر کہنے لگا، ”یہ نئی پوشاک مجھے علی بابا نے لے

کر دی ہے۔ ”اسفندیار نے بتایا کہ رات ڈاکوؤں نے بغداد کے ایک شہر کے ایک سوداگر کے ہاں ڈاکہ ڈالا اور مال و دولت کے ساتھ اس کی اکلوتی بیٹی کو بھی اغوا کر کے لے گئے ہیں۔ شہزاد کو بڑا دکھ ہوا کہ بے چہری لڑکی ڈاکوؤں کے غلام میں سخت پریشان ہو گی اس کی مدد کرنی چاہیے۔ اس نے اسفندیار کو کچھ نہ بتایا اور رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ شہزاد کو کئی بار اپنے جن دوست سانچی کا خیال آیا تھا کہ نہ جانے وہ کہاں ہو گا۔ کس حل میں ہو گا اسے اپنے تعویذ کی بھی فکر تھی کیونکہ اگر تعویذ نہ ملا تو وہ واپس اپنے زمانے اپنی دنیا میں نہ جا سکے گا، تبھی نہ جاسکے گا لیکن اس وقت شہزاد سوداگر کی اکلوتی بیٹی کی مصیبت کا حال سن کر زیادہ پریشان تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ علی بابا والے ہی چالیس چور یعنی ڈاکو ہیں جنہوں نے سوداگر کی بیٹی کو اغوا کیا ہے۔

جب رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تو شہزاد چپکے سے حجرے سے نکلا اور ڈاکوؤں کے غلام کی طرف چل پڑا۔ ڈاکوؤں کے غلام کا راستہ اسے آتا تھا وہ یہ بھی جانتا تھا کہ غلام کا منہ کن الفاظ کے پکڑنے سے کھلتا ہے۔ وہ جب غلام کے سامنے پہنچا تو چاروں طرف رات کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ شہزاد کو صرف ایک خطرہ تھا کہ کہیں چالیس ڈاکو غلام کے اندر نہ بیٹھے ہوں اس نے غلام کی دیوار سے کان لگایا غلام میں سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ ڈاکو رات کے وقت ہی ڈاکہ ڈالنے جاتے ہیں، شہزاد نے سوچا پھر وہ غلام کی دیوار کے سامنے دونوں بازو کھول کر کھڑا ہو گیا اور بلند آواز سے پکارا۔

”کھل جا سم سم“

گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ غلام کا دروازہ اپنے آپ کھل گیا۔ شہزاد دوڑ کر غلام میں داخل ہو گیا۔ اندر جاتے ہی پلٹ کر اس نے دوسرے الفاظ کہے۔

”بند ہو جا سم سم“

اور غلام کا دروازہ بند ہو گیا۔ شہزاد غلام کی دیوار کے ساتھ لگا دے پاؤں آگے





بڑھا۔ غار آگے جا کر گھوم جاتا تھا۔ آگے اسی طرح جگہ جگہ ہیرے جواہرات اور اشرفیوں کے ڈھیر لگے تھے۔ سونے چاندی کے برتن اور لوگوں کے گھروں سے لوٹا ہوا قیمتی سامان پڑا تھا جب شنزاد کو یقین ہو گیا کہ غار ڈاکوؤں سے خالی ہے تو اس نے آواز دی، ”اندر کوئی ہے تو آواز دے۔“

دو تین بار پکارنے پر ایک لڑکی کی گھٹی ہوئی آواز آئی، ”میں یہاں ہوں مجھے یہاں سے نکالو۔“ شنزاد آواز کی طرف لپکا کیا دیکھتا ہے کہ ایک پتھر لے ستون کے پیچھے گہرا گڑھا ہے جس میں ایک لڑکی رسیوں سے جکڑی پڑی ہے۔ لڑکی کے منہ پر کپڑا بندھا ہوا ہے۔ شنزاد جلدی سے گڑھے میں اتر گیا، لڑکی کے منہ پر بندھا ہوا کپڑا ہٹایا، رسیاں کھول کر اسے آزاد کیا اور کہا،

”گھبراؤ نہیں بہن۔ میں تمہاری ہی تلاش میں یہاں آیا تھا۔ ڈاکو یہاں سے کب گئے تھے؟“

لڑکی سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے کہا،

”تھوڑی دیر پہلے، تھوڑی دیر پہلے۔“

شنزاد نے اسے گڑھے سے باہر نکالا ایک جگہ دیوار کے ساتھ مشعل جل رہی تھی۔ وہ لڑکی کو وہاں روشنی میں لے آیا اور اسے تسلی دینے لگا، ”میں تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں گا فکر نہ کرو بہن۔“

لڑکی رونے لگی، بولی، ”یہ سب کچھ اس منحوس تعویذ کی وجہ سے ہوا ہے۔“

پہلے روز میں نے اسے پہنا تو میری ماں بیمار ہو گئی دوسرے دن ہمارا گھوڑا مر گیا اور تیسری رات ڈاکوؤں نے ہمارا گھر لوٹ کر مجھے اغوا کر لیا۔“ تعویذ کے نام پر شنزاد کچھ چونکا۔

”وہ تعویذ تمہیں کس نے دیا تھا؟“ شنزاد نے پوچھا۔

لڑکی بولی۔ ”میری ہی قسمت پھوٹ گئی کہ جو بغداد کے ایک جوہری سے خرید لیا۔“

”وہ چاندی کا تھا؟“ شنزاد نے سوال کیا۔

”ہاں، چاندی کا تھا۔“

”اوپر ہلال یعنی آدھے چاند کی شکل تھی؟“ شنزاد نے بے تابی سے پوچھا۔ لڑکی نے کہا،

”ہاں اس پر ہلال کی شکل بنی ہوئی تھی مگر تم یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہو؟“ شنزاد نے سر پکڑ لیا اور بولا۔

”میری بہن کیا تم بتا سکتی ہو کہ وہ تعویذ تم نے کہاں رکھا تھا؟“

لڑکی نے بے زاری سے کہا،

”رکھنا کہاں تھا کم بخت میرے گلے میں تھا ڈاکوؤں نے اسے نوچ لیا۔“

”پھر وہ ضرور لوٹے ہوئے مل میں کہیں ہو گا۔“

یہ کہہ کر شنزاد نے ادھر ادھر بکھری ہوئی چیزوں کی تلاشی لینی شروع کر دی لڑکی نے اسے وہ سلمان دکھایا جو ڈاکوؤں نے ان کے گھر سے لوٹا تھا مگر ان میں بھی سانچے کا تعویذ کہیں نہیں تھا۔

لڑکی نے تعجب سے پوچھا۔

”تم اس تعویذ کو کس لیے تلاش کر رہے ہو؟“

شنزاد نے آہ بھر کر کہا، ”بہن! یہ بات میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔ دعا کرو کہ

مل جائے۔“

ابھی شنزاد تعویذ تلاش کر ہی رہا تھا کہ غلہ کے باہر گھوڑوں کے ٹپوں کی آواز بلند

ہوئی۔ لڑکی نے گھبرا کر کہا۔

”ڈاؤ آگئے۔ اب کیا ہو گا؟“

اور وہ رونے لگی۔ شنزاد اسے ساتھ لے کر غار کے دروازے کی طرف دوڑا کہ کھل جاسم سم کے الفاظ پڑھ کر باہر نکل جائے۔ لیکن باہر ڈاؤ بھی غار کے دروازے پر پہنچ چکے تھے باہر سے ڈاؤں کے سردار کی آواز آئی،

”کھل جاسم سم“

شنزاد نے جلدی سے لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر غار میں پیچھے کی طرف بھاگا کہ ڈاؤں کی نظروں سے بچ سکے کیونکہ جب ڈاؤ غار کے اندر داخل ہو رہے ہوں گے تو وہ لڑکی کو لے کر باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ وہ غار کے پیچھے جا کر ستونوں میں چھپ گئے۔ لڑکی کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ موت اسے سامنے نظر آرہی تھی۔ شنزاد کو ایک بات کی تسلی تھی کہ وہ مر نہیں سکتا کیونکہ ماضی میں آیا ہوا ہے۔ مگر لڑکی کے بارے میں اسے خطرہ تھا کہ ڈاؤ اب اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے ڈاؤں کے سردار نے غار کا دروازہ بند کر دیا اور اپنے دو خاص ڈاؤ ساتھیوں سے کہا،

”اس لڑکی کو میرے سامنے پیش کرو۔“

ڈاؤ گڑھے کی طرف گئے۔ دوسرے ہی لمحے گھبرائے ہوئے آئے اور بتایا کہ لڑکی وہاں نہیں ہے۔ سردار اٹھ کھڑا ہوا اور چیخ کر بولا، ”یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ کہاں جا سکتی ہے وہ لڑکی۔ غار کھولنے کا راز ہمارے سوائے کسی کو معلوم نہیں وہ غار میں ہی ہوگی اسے تلاش کرو۔“

تھوڑی دیر میں ہی لڑکی کے ساتھ شنزاد کو بھی پکڑ کر سردار کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ سردار نے تلواریں کھینچ لی اور غصے سے غرایا،

”یہ لڑکا کہاں سے آیا، ضرور اس کو غار کھولنے کا راز معلوم ہو گیا ہے، میں ان دونوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کروں گا۔“

اتنی دیر میں شنزاد نے مشعلوں کی روشنی میں ڈاکوؤں کے سردار کے گھلے میں پڑا اپنا تعویذ دیکھ لیا تھا وہ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر بولا، ”سردار تم مجھے نہیں مدد سکتے لیکن میں تمہیں، اور تمہارے چالیس چوروں کو آنے والی اذیت ناک موت سے بچا سکتا ہوں۔“

شنزاد کو معلوم تھا کہ علی بابا چالیس چور کی کہانی کے مطابق یہ سارے ڈاکو کپڑوں کے اندر کھولتا ہوا تیل ڈالنے سے مرجائیں گے اور سردار کو مرجینا خنجر گھونپے گی۔ سردار نے گرج دار آواز میں کہا،

”کیا بکواس کر رہے ہو؟ تم اپنی جان کی فکر کرو۔“

شنزاد کو ایک بد پھر خیل آیا کہ وہ واقعات کے تسلسل میں دخل نہیں دے سکتا ورنہ تاریخ کا سلسلہ درہم برہم ہو جائے گا، سانچی جن کا تعویذ اس نے سردار کے گھلے میں دیکھ لیا تھا۔ اسے ایک تدبیر سوچھی۔ اسی تدبیر سے وہ معصوم لڑکی کی جان بچا سکتا تھا۔ اس نے سردار سے کہا۔

”سردار! میں جانتا ہوں کہ میرا آخری وقت آن پہنچا ہے، لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم ایک بہادر سردار ہو اور بہادر سردار جس کو قتل کرتے ہیں اس کی آخری خواہش ضرور پوچھ لیتے ہیں۔“

شنزاد نے اللہ کا نام لے کر اندھیرے میں ایک تیر چلایا تھا کہ شاید نشانے پر لگ جائے ورنہ اس کے پاس ایک دو سری ترکیب بھی تھی مگر سردار شنزاد کی باتوں میں آگیا۔ اس نے کہا،

”اچھا بتاؤ۔ تمہاری آخری خواہش کیا ہے، اگر میرے اختیار میں ہوئی تو میں اسے ضرور پورا کروں گا۔“

شنزاد نے کہا، ”سردار! تمہارے گھلے میں جو چاندی کا تعویذ ہے اسے



تھوڑی دیر کے لیے میرے گلے میں ڈال دو بس یہی میری آخری خواہش ہے میں تو قتل ہو جاؤں گا۔ تم تعویذ واپس لے سکتے ہو۔“

سوداگر کی بیٹی جو شنزاد کے پیچھے موت کے خوف سے سہمی کھڑی تھی دل میں شنزاد کو کونسنے لگی کہ اس نے کس قسم کی آخری خواہش کی ہے۔ سردار نے کہا، ”ٹھیک ہے میں یہ تعویذ تمہارے گلے میں ڈال کر تمہاری آخری خواہش پوری کرتا ہوں۔“

یہ کہہ کر سردار نے سانچی جن کا دیا ہوا تعویذ اپنے گلے سے اتارا اور اپنے ساتھی سے کہا، ”یہ تعویذ اس لڑکے کے گلے میں ڈال دو۔“ لاکٹ شنزاد کے گلے میں پڑ گیا تو شنزاد نے فوراً اس پر ہاتھ رکھ دیا اور زور سے چلایا، ”سانچی! سانچی! سانچی!“

اس کے ساتھ ہی ایک دھماکہ سا ہوا زمین ہل گئی جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ ڈاکو ادھر ادھر لڑھک گئے سردار بھی پیچھے کو گر پڑا اس کے ہاتھ سے تلواریں گر پڑی۔ پھر ایک شعلہ سا بلند ہوا اور سانچی جن شنزاد کے سامنے کھڑا تھا، مگر اس کی گردن میں لوہے کی زنجیر پڑی تھی ایک لڑکے کو نمودار ہوتے دیکھ کر پہلے تو ڈاکو اور سردار دنگ سے ہو کے رہ گئے پھر تلواریں سونت کر اس کی طرف لپکے سانچی جن زمین سے فضا میں اچھلا پھر تیز روشنی کا گولہ بن کر پھنکارتا ہوا ڈاکوؤں میں ٹھس گیا اور ان کے گرد گھومنے لگا روشنی کے گولے میں سے دہشت ناک پھنکریں نکل رہی تھیں اس کی پھنکار اور طلسمی تپش سے سردار سمیت سارے کے سارے ڈاکو بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ سانچی دوبارہ لڑکے کی شکل میں آگیا اور شنزاد سے بولا،

”یہاں سے نکل جاؤ، ساری جادوگر میرے پیچھے لگا ہے، یہ طلسمی زنجیر اسی نے میری گردن میں ڈالی ہے، تم نے چلتے وقت میرا ہاتھ چھوڑ کر مجھے بھی مصیبت میں ڈال دیا

”ہے۔“

سوداگر کی بیٹی کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ وہ خوف کے مدے کانپ رہی تھی۔ سانچی نے لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا: ”اس لڑکی کو اس کے ماں باپ کے پاس پہنچا دو میں پھر ملوں گا ساری میری جان کا دشمن جادوگر میری طرف بڑھ رہا ہے۔ میں جا رہا ہوں، میں جا رہا ہوں۔“ اور سانچی دوبارہ روشنی کا گولہ بن گیا اور پھنکرتا ہوا غدر کی چھت کی طرف اڑا اور غائب ہو گیا۔ شنزاد نے سوداگر کی بیٹی کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر غدر کے دروازے کی طرف بھاگا۔ دروازہ بند تھا شنزاد نے بلند آواز میں کھل جاسم سم کہا۔ دروازہ کھل گیا وہ غدر سے نکل کر کھلے صحرا میں آگئے اور بغداد شہر کی طرف چلنے لگے۔ سوداگر کی بیٹی نے ڈاکوؤں کے چنگل سے نکلنے کے بعد اللہ کا شکر ادا کیا اور شنزاد سے کہا، ”تم ضرور کوئی جادوگر ہو جس نے ایک جن لڑکا اپنے قبضے میں کر رکھا ہے۔“

شنزاد بولا، ”میں جادوگر نہیں ہوں ہاں جو تعویذ تم نے جوہری سے خرید کر اپنے گلے میں ڈالا تھا اور جو بعد میں ڈاکو لے اڑے اور اب میرے گلے میں ہے یہ مجھے میرے دوست جن سانچی نے دیا تھا اور اسی تعویذ کی مدد سے سانچی ہمارے پاس آیا اور اس نے ڈاکوؤں سے ہماری جان بچائی۔“

لڑکی نے کہا، ”مگر یہ تعویذ میرے لیے تو بڑا منحوس ثابت ہوا تھا۔“ شنزاد نے جواب دیا، ”لیکن اسی تعویذ کے مالک نے تمہاری جان بھی تو بچائی ہے۔“

”مگر تمہارے جن دوست کے گلے میں زنجیر کیوں بندھی تھی کیا واقعی اسے ساری نے قید کر رکھا ہے؟“ لڑکی نے پوچھا۔

شنزاد نے کہا، ”ان باتوں کو تم اب بھول جاؤ اور اپنے ماں باپ کے پاس جا کر اطمینان

سے رہو۔“

لڑکی نے فکر مند ہو کر کہا، ”لیکن یہ ڈاکو میرے گھر آکر مجھے پھر مار ڈالیں گے۔ انھوں نے ہمارا گھر دیکھ رکھا ہے۔“ شنزاد بولا، ”اس کی تم فکر نہ کرو، دو ایک دنوں میں یہ سارے کے سارے ڈاکو غلی بابا کی حویلی میں اپنی موت آپ مر جائیں گے۔“

سوداگر کی بیٹی سمجھ نہ سکی کہ شنزاد کیا کہہ رہا ہے۔ لڑکی کا گھر آگیا۔ اس کے ماں باپ بیٹی کی جدائی میں نڈھال تھے۔ شنزاد نے ان کی لڑکی ان کے حوائے کی توجہ خوشی سے نہال ہو گئے۔ شنزاد نے لڑکی کو چھوڑا اور سوداگر کی حویلی سے نکل کر سیدھا در سے کے حجرے میں آگیا۔ اسفندیار وہاں نہیں تھا۔ شنزاد سو گیا صبح اٹھ کر اس نے مسجد میں نماز پڑھی اور واپس حجرے میں آیا وہاں اسفندیار موجود تھا۔ شنزاد نے اسے سانچی جن اور تعویذ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا اور اس سے کہا کہ وہ حکیم رازی سے بات کر کے اس کے دوست سانچی کو سامری جادوگر کی قید سے رہائی دلائے۔ اسفندیار نے کہا کہ رازی حکیم طبیب اور فلسفی ہیں ان کا ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں ہاں میں تمہیں ایک عامل کے پاس لیے چلتا ہوں وہ شاید تنیاری مدد کر سکے۔ اسفندیار شنزاد کو ساتھ لے کر بغداد کی ایک گلی میں واقع عامل کے گھر لے آیا وہاں دیواروں پر انسانوں اور جانوروں کی کھوپڑیاں لگی تھیں۔ عامل نے شنزاد کی بات غور سے سنی پھر اس سے کہا،

”سانچی ایک مسلمان جن کا بیٹا ہے اور نیک دل لڑکا ہے اس کے ہاتھ سے کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچی اس نے ہمیشہ دکھی لوگوں کی مدد کی ہے میں اسے سامری کے ظلم سے ضرور نجات دلاؤں گا۔ تم ایسا کرو کہ یہاں سے تھوڑی دور ایک ٹیلے کے پاس ایک بھول کا درخت ہے اس درخت پر دو گدھ بیٹھے ہوں گے۔ تمہیں آتا دیکھ کر وہ

آپس میں لڑنے لگیں گے پھر ایک گدھ کا پر نیچے گرے گا تم وہ پر اٹھا کر اپنی آنکھوں کے سامنے رکھو گے تو تمنیہیں غیب کی چیزیں نظر آنا شروع ہو جائیں گی۔ تم مشرق کی جانب سو قدم چلنا، آگے ایک خشک کنواں آئے گا، کنوئیں کی سیڑھیاں اترو گے تو بائیں طرف ایک شگاف کے اندر سرنگ میں سانچی تمنیہیں ملے گا بس اس سے زیادہ میں تمنیہاری مدد نہیں کر سکتا اللہ تمنیہارے ساتھ ہے۔“

شہزاد وہاں سے نکلتے ہی نیلے کی طرف روانہ ہو گیا۔ نیلے کے پاس آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ بول کا ایک درخت ہے جس کی ٹہنی پر دو گدھ بیٹھے ہیں شہزاد کو آتا دیکھ کر انھوں نے لڑنا شروع کر دیا اتنے میں گدھ کا پر نیچے گر پڑا۔ شہزاد نے اٹھا کر اپنی آنکھوں کے آگے رکھا تو اسے زمین کے نیچے دبے ہوئے خزانے نظر آنے لگے۔ اس نے پر ہنایا اور مشرق کی طرف چلنے لگا پورے سو قدم چلنے کے بعد ایک کنواں آگیا جو بڑا گہرا تھا۔ ایک زینہ کنوئیں کی تہ کو جاتا تھا شہزاد زینے سے اتر کر کنوئیں کی تہ میں آیا تو بائیں جانب سرنگ کا تاریک شگاف تھا۔ وہ شگاف میں گھس گیا یہ ایک تاریک اور سنسان سرنگ تھی۔ شہزاد نے آنکھوں کے آگے گدھ کا پر رکھ لیا تھا۔ اچانک اسے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی لڑکا کر لو رہا ہو۔ شہزاد آواز کی طرف لپکا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک ستون کے ساتھ سانچی اس کا دوست جن لڑکا زنجیروں سے بندھا ہوا ہے اس کا سر سینے پر لٹک رہا ہے اور وہ کراہ رہا ہے۔ شہزاد نے جلدی سے سانچی کا سراو پر اٹھایا اور کہا،

”سانچی! میں تمنیہارا دوست ہوں، تمنیہارا دوست!“

شہزاد نے زنجیروں کو کھولنے کی کوشش کی مگر اسے جھٹکے لگنے لگے۔ سانچی نے کہا،

”ان زنجیروں میں سامری جادوگر کے طلسم کا اثر ہے شہزاد یہاں سے جان بچا کے بھاگ جاؤ۔ سامری کو خبر ہو گئی ہے۔ وہ تمنیہیں ہلاک کرنے آجائے گا۔“ شہزاد نے سانچی کو گدھ کے پر کا حال بتایا تو اس نے کہا،

”اس ہند کوزنجیر کے ساتھ لگاؤ۔“

شہزاد نے جوں ہی گدھ کے ہند کوزنجیر کے ساتھ لگایا، زنجیر ٹوٹ کر نیچے گر پڑی۔  
ساپنجی آزاد ہو گیا، مگر عین اسی وقت سرنگ میں ایک بھانک جیج کی آواز گونجی۔ ساپنجی نے  
گدھ کا ہند شہزاد کے ہاتھ سے لے لیا اور بولا،

”کنوئیں سے نکل جاؤ۔ سامری جادوگر پہنچ گیا ہے۔ جلدی کرو، نہیں تو میرے  
ساتھ تم بھی ہمیشہ کے لیے اس کنوئیں میں بند ہو جاؤ گے۔“

شہزاد زینہ چڑھ کر کنوئیں سے باہر نکل آیا۔ سرنگ میں تیز آندھی چلنے لگی، بادل  
گر جنے لگے، جیسے طوفان آگیا ہو۔ ساپنجی نے گدھ کا ہند اپنی آنکھوں کے آگے رکھا ہوا تھا۔  
اس پر آندھی کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ سرنگ کے دالان کی طرف بھاگا۔ دالان میں  
ایک ستون کے طاق میں چھپکلی کا پتھر کا سر باہر نکلا ہوا تھا۔ اس وقت سرنگ میں ہیبت ناک  
انسانی شکل والا عفریت اپنے نتھنوں سے آگ کے شعلے نکالتا دالان کے قریب پہنچ گیا تھا۔  
اس کے حلق سے ڈراؤنی آوازیں نکل رہی تھیں۔ ساپنجی نے چھپکلی کے سر کو طاق میں سے  
اکھاڑ کر زمین پر دے مارا۔ پتھر کی چھپکلی کا سر چمکنا چور ہو گیا۔ ساتھ ہی عفریت کا سر بھی گردن  
سے کٹ کر چمکنا چور ہو گیا مگر وہ بغیر سر کے ہی ساپنجی کی طرف لپکا۔ ساپنجی فضا میں اچھلا اور  
عفریت کے اوپر سے غوطہ لگا کر سرنگ کی دوسری جانب گرا اور زینے کی طرف دوڑا۔  
عفریت بھی اس کے پیچھے تھا۔ سرنگ سے نکلتے ہی اس نے گدھ کے ہند سے زمین پر لکیر کھینچی  
اور بلند آواز میں کہا،

”اے سامری کے عفریت! اگر تو نے یہ لکیر پار کی تو جل کر بھسم ہو جائے گا۔“

یہ کہہ کر وہ کنوئیں کا زینہ چڑھنے لگا مگر عفریت آگے بڑھتا ہی گیا۔ جوں ہی وہ  
زمین پر کھینچی ہوئی طلسمی لکیر پر سے گزرا ایک دھماکہ خیز شعلے نے اسے جلا کر راکھ کر دیا۔  
کنوئیں کے باہر شہزاد بے چینی سے ساپنجی کا انتظار کر رہا تھا۔ ساپنجی کو دیکھ کر اس کی جان



میں جان آئی۔ سانچی نے کہا،

”سامری جادوگر دوسرا حملہ کرنے والا ہے دریا کی طرف بھاگو۔“

دونوں دریا کی طرف دوڑنے لگے ان کے دوڑتے ہی کنوئیں کے اندر سے ایک ایسا سانپ نکلا جس کے تین منہ تھے ہر منہ میں سے سرخ زبان پھنکے کے ساتھ لہرا رہی تھی۔ یہ سانپ مگر کچھ جتنا بڑا تھا وہ بھی سانچی اور شہزاد کی طرف لپکا۔ سانپ بڑی تیز رفتاری کے ساتھ زمین پر ریٹکتا ہوا دونوں کے قریب سے قریب پہنچ رہا تھا دریا پر ایک کچی اینٹوں کا اونچا مینار بنا ہوا تھا۔ سانچی چلایا،

”شہزاد میرے پیچھے پیچھے آنا۔“

مینار میں ایک زینہ اوپر جاتا تھا۔ یہ مینار سات منزلہ اونچا تھا۔ یہ دونوں دوسری منزل میں تھے تو سانپ پہلی منزل میں پہنچ گیا دونوں کا فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا جب وہ ساتویں منزل پر پہنچے تو سانپ بھی وہاں آگیا شہزاد گھبرا گیا تھا۔ سانچی نے کہا،

”شہزاد ایک ہاتھ تو گلے کے تعویذ پر رکھ دو اور دوسرا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔“

شہزاد نے ایسا ہی کیا تین منہ والے سانپ کی ایک لمبی زبان شہزاد کے پاؤں سے ٹکرائی اسے یوں لگا کہ جیسے کسی نے اس کے جسم سے انگڑا لگا دیا ہو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی ٹھیک اسی وقت سانچی نے شہزاد کا ہاتھ تھام کر مینار کی ساتویں منزل سے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ شہزاد نے آنکھیں بند کر لیں اسے یقین تھا کہ دریا میں گریں گے مگر وہ دریا میں نہ گرے شہزاد آنکھیں کھولنے ہی لگا تھا کہ سانچی کی آواز آئی۔

”شہزاد آنکھیں بند رکھنا۔“

شہزاد کو اپنا جسم روئی کے گالے کی طرح ہلکا ٹھلکا ہو کر فضا میں اڑتا ہوا محسوس ہو رہا تھا پھر اسے یوں لگا کہ جیسے سانچی کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہو اس کے بعد وہ کسی

بہت نرم شے کے ساتھ آن لگا اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ وہ اپنے بستر میں لیٹا ہے لحاف سینے سے ہٹا ہوا ہے۔ پہلے تو شنزاد کو یقین ہی نہ آیا کہ اس نے کوئی خواب دیکھا ہے پھر اس نے ڈرتے ڈرتے نیبل لیمپ جلایا، کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ دیوار پر لگا کاک صبح کے چار بج رہا تھا۔ شنزاد اٹھ کر بیٹھ گیا اور کمرے میں چاروں طرف تکتے لگا۔ تعویذ اس کے گلے میں پڑا تھا اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ خواب میں اسلامی تاریخ کے سنہرے زمانے میں نکل گیا تھا جہاں اس نے نامور مسلمان حکیم طبیب اور فلسفی ابو بکر محمد بن ذکریا رازی کو نہ صرف اپنی آنکھوں سے دیکھا بلکہ ان سے باتیں بھی کی تھیں۔ اس کا دل سانچی کی دوستی کے نیک جذبات سے بھر گیا کیونکہ سانچی ہی اسے پرانے زمانے میں لے گیا تھا۔

محلے کی مسجد سے فجر کی اذان کی آواز بلند ہوئی۔

شنزاد کلمہ پڑھتا بستر سے اتر آیا دانت صاف کر کے اس نے وضو کیا اور نماز کے لیے مسجد کی طرف چل دیا۔ گھر واپس آتے ہوئے شنزاد سوچنے لگا کہ یورپ اور امریکہ والوں نے آج سائنس، طب، اور دوسرے میدانوں میں جتنی ترقی کی ہے اس میں ہمارے مسلمان سائنس دانوں کا کس قدر گہرا ہاتھ ہے ان مسلمان سائنس دانوں، حکیموں، طبیبیوں، ہونہ جغرافیہ دانوں اور حساب دانوں نے آج سے سینڑوں برس پہلے بغداد اور قرطبہ میں بیٹھ کر جو اصول تیار کیے یورپ نے انہی اصولوں پر چل کر آج اتنی ترقی کی ہے۔ یورپ کی یونیورسٹیوں میں تو آج بھی مسلمان سائنس دانوں کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔

یہ سوچ کر شنزاد کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ بلاشبہ اس کا تعلق ایک ایسی قوم اور ایک ایسے دین سے تھا جس نے ساری دنیا کو جہالت کی تاریکیوں سے نکالا اور چاروں طرف علم کی روشنی پھیلائی۔



